نکل رہے ہوں

کئی ہفتے گذر گئے، پرملا وش کو سینے سے لگائے روتی رہی، جس نعمت کو پا کر اس نے مصیبت کو راحت سمجھا تھا، اس سے آج وہ محروم ہوگئی۔ ماں کی مامتا میں جس شمع سے امید اور صبر کی روشنی پا رہی تھی وہ شمع بجھ گئی

سیٹھ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ کڑی ہو پرملا، جس کی موت پر ایشور کا شکریہ ادا کرنا چاہئے، اس کی موت پر تم رو رہی ہو۔ ظلم کے سامنے سینہ سپر ہو جانے سے بہتر موت کس کو نصیب ہوتی ہے

پرملا نے وحشت زدہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی تم سمجھتے ہوگے کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے، میں ایسا نہیں سمجھتی کیوں سمجھوں ہائے میرا لال میرا راجہ، میرا سورج، میرا چاند میری زندگی کے سہارے تجھے کھو کر کیسے صبر کروں جسے گود میں دیکھ کر نہال ہوگئی تھی، اسے میں بے پڑا دیکھ کر دل کو کیسے سنبھالوں

اسی رات کو وہ غم نصیب ماں دنیا سے رخصت ہوگئی چڑیا اپنے بچے کی تلاش میں پنجرے سے نکل گئی اور سیٹھ جی سب چھوڑ آج بھی مزدوروں کے محال میں ان کی مدد میں مصروف نظر آتے ہیں۔

دو گھنٹے گذر گئے اور کرشن چندر گھر نہیں آیا، ماں بے تاب ہونے لگی سیٹھ جی کو بھی تشویش ہوئی، کیا کرنے لگا، اُس کی عادت ہے کہ گوپی کے گھر جاتا ہے تو اُسے کھانے پینے تک کی سدھ نہیں رہتی۔

دوپہر ہوا، شہر میں خبریں اڑنے لگیں کہ مل میں ہڑتال ہو گئی، پولیس لاریوں میں دوڑی جا رہی ہے، پرمیلا دہشت سے لرزنے لگی، بار بار کھڑکی سے دیکھتی، ابھی تک نہیں آیا، کہیں ہڑتالیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔

اچھا یہ مجمع کیسا چلا آ رہا ہے، اسی طرف آتا ہے، کوئی ایک ہزار آدمی ہوں گے، کوئی ارتھی معلوم ہوتی ہے، ارتھی ہے۔ سیٹھ جی بھی جھانکنے لگے، ضرور کوئی بڑا رئیس مر گیا ہے۔

وہ جلوس پرمیلا کے مکان کے نیچے رُک گیا۔ اور آواز آئی "شہید کرشن چندر زندہ باد!" پرمیلا کا خون جیسے خشک ہو گیا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں زینے کی طرف دوڑی، اور بے ہوکر گر پڑی۔

سیٹھ جی نے بھی یہ نعرہ سنا۔ مگر اُن کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، زاہدانہ توکل صبر اور سکون کے ساتھ نیچے آئے۔ لاش کو گلے سے لگا کر اس کا بوسہ لیا، دریافت حال کیا۔ معلوم ہوا مل میں آج ہڑتال تھی۔ منیجر نے حاضری کے متعلق کچھ نئے قاعدے نافذ کئے تھے، مزدوروں نے اسے منظور نہ کیا، مل میں ہڑتال ہوئی۔ کرشن چندر کو مزدوروں نے اپنا سرغنہ بنایا، اس کی کم عمری کے باوجود مزدوروں کو اس پر کامل اعتماد تھا، اُن کو یقین تھا۔ یہ گوپی کا اوتار ہے، گوپی کی بیوی نے اسی معاملہ میں مشورہ کرنے کے لئے آج کرشنا کو بلایا تھا۔ کرشنا مزدوروں کا نمائندہ بن کر کئی آدمیوں کے ساتھ پولیس کی مزاحمت کے باوجود منیجر سے ملنے جا رہا تھا۔ ہنگامہ ہو گیا، پولیس نے گولیاں چلائیں اور کرشن چندر اُن کی بندوقوں کا نشانہ بن گیا۔

سیٹھ جی اُسی اطمینان کے ساتھ اوپر گئے، اور پرمیلا کو سنبھال کر نیچے لائے، پرمیلا لاش سے لپٹ گئی، اور بین کر کے رونے لگی۔ کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جس سے آنسو

کرشن چندر زینے کے پاس رُک کر بولا جا کر اماں سے کہہ آؤں، آپ کے لیے نئے کپڑے
سے رکھے ہیں

جب چندر نے لڑکے کو گود میں لے کر اس طرح اس کا بوسہ لیا کہ وہ کچھ ہو جانا، اُسے گود میں
لیے ہوئے زینہ پر چڑھے اور سے مکان پر چڑھے چلے گئے

(۶)

آج سیٹھ جی کو آئے ساتواں دن ہے، صبح کا وقت ہے، سیٹھ جی سندھیا کرنے جا رہے ہیں کہ
گوپی ناتھ کی بیٹی نے آکر پرملا سے کہا ماما جی اماں کا جی آج اچھا نہیں ہے بھیا کو بلا رہی ہیں
پرملا نے کہا آج تو وہ نہ جا سکے گا، اس کے پاس آگئے ہیں، ان سے باتیں کر رہا ہے
کرشن چندر نے کمرہ میں سے اس کی باتیں سن لیں، دوڑتا برآمدہ میں آکر بولا، نہیں اماں
میں دادا سے پوچھ کر دادا جی کے لیے چلا جاؤں گا

پرملا نے جھلا کر کہا، تو وہاں جاتا ہے تو تجھے گھر کی سدھ نہیں رہتی، ہر جانے آن
سب لوگوں نے تجھے کیا کوئی سکھا دی ہے

"میں بہت جلد چلا آؤں گا اماں تمہارے پیروں پڑتا ہوں"

"تو بھی عجب لڑکا ہے، وہ بیچارے اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں جانے کی پڑی ہے"

سیٹھ جی نے یہ باتیں سن کر نیچے آکر کہا، رنج ہے، جلدی آنے کو کہہ رہے ہیں تو جانے دو

کرشن چندر خوش ہو کر بچی کے ساتھ چلا گیا، پرملا بولی جب سے میں نے گوپی کی
تصویر دیکھی ہے، مجھے ہر دم کا کھٹکا رہتا ہے کہ بھگوان نہ جانے کیا کرنے والے ہیں، ایسی ہی معلوم
ہوتا ہے کہ اسی کی تصویر ہے سیٹھ جی نے بھی تشویش ظاہر کی، میں تو پہلی بار دیکھ کر چونک
گیا تھا معلوم ہوا گوپی ناتھ ہی کھڑا ہے

"گوپی ناتھ کی گھر والی کہتی ہے، اس کی چال ڈھال بھی گوپی ہی جیسی ہے"

"بھگوان کی لیلا ہے کہ جس کی میں نے جان لی، وہ میرے بیٹے کے روپ میں ہم

تصویر اور اس حقیقت میں کتنا فرق نظر آیا۔ تصویر زمانہ کے اثرات سے مامون تھی، اس پر سُکھ دُکھ کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہی شرمیلی نگاہیں تھیں۔ وہی دلفریب تبسم، اس حقیقت میں انہیں عالم کا جلال نظر آیا۔ اور اُن کا دل وجد میں ڈوبے ہوئے نغمہ کی طرح تھرتھرا اُٹھا۔ ایک ولولہ سا اُٹھا کہ اس کے قدموں پر گر پڑوں اور کہوں اس بدنصیب کو اپنے آنچل میں پناہ دو، مگر اس ہیئت کذائی میں اس کے رُوبرو جانے انہیں شرمناک معلوم ہوئی۔

پرمیلا نے ٹھاکر جی کی پوجا کر کے تُلسی دل لیا۔ اور مندر کے باہر نکلی، خوب چند بھی اُس کے پیچھے چلے، کچھ دُور آگے چل کر ایک کئی منزل کا "جال" ملا۔ پرمیلا "جال" میں داخل ہوئی سیٹھ جی بھی اندر گھسے مگر وہ تو ایک پوری بستی تھی۔ پرمیلا کدھر گئی۔ کیا خبر۔ دفعتاً ایک نوعمر لڑکے کو اندر سے نکلتے دیکھ کر وہ پکار اُٹھے، ذرا سنو تو بیٹا۔ تم سے کچھ پوچھنا ہے۔

لڑکا آہستہ آہستہ اُن کی طرف آیا، ایک لمحہ غائر نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا، پھر چشم پُرآب ہو کر اُن کے قدموں سے لپٹ گیا، سیٹھ جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ تو گوپی ہے صرف عمر میں اس سے کچھ کم، وہی صورت، وہی قدوقامت وہی خط و خال، جیسے وہ عالم بالا سے اُتر آیا ہو۔ اور تازہ اور جوان ہو کر، انہیں رعشہ سا آ گیا۔ ہیبت اُن کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔

کرشن چندر نے ایک لمحہ میں اُٹھ کر کہا، ہم تو کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہے تھے آیئے، اندر آیئے، میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا، کہیں بھی دیکھ کر پہچان جاتا۔

خوب چند اس کے ساتھ اندر چلے تو، مگر اُن کا دل جیسے خیالات کے بھنور میں پڑا ہوا تھا۔ گوپی کی صورت کیا کبھی اُن کے ذہن سے اُتر سکتی تھی۔ اسی چہرہ کو انہوں نے کتنی ہی بار خواب میں دیکھا تھا۔ وہ سانحہ اُن کی زندگی کا سب سے یادگار وقوعہ تھا گوپی کی وہ صورت اس وقت بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

تو وہ آنکھوں میں سما نہیں رہا ہے

انہوں نے اس بے تکلفی سے پان والے کا ہاتھ پکڑ لیا گویا پرانی دوستی ہے اور
بولے اچھا اُس کے لڑکا بھی ہے، کہاں رہتی ہیں سنتھالی، ایسا ہو تو جاکر سلام کر آؤں،
بہت دنوں ان کا نمک کھایا ہے

سولی نے پر میلا کے مکان کا پتہ دیا وہ اسی محلہ میں رہتی تھی، سیٹھ جی گویا آسمان
میں اُڑتے ہوئے یہاں سے چلے پرمیلا کے گھر کی طرف

راستے میں ٹھاکر جی کا مندر نظر آیا، سیٹھ جی نے مندر میں جاکر مورتی کے سامنے سر
جھکا دیا اُن کے لئے ایک ایک رونئیں کو عقیدت اور احسان کے جذبے سے نکل رہے تھے اس
طولانی کوفت اور یاس کے عالم میں ان کی مجروح اور محصور آتما کو اگر کہیں عافیت ملی تھی تو
وہ یہی عبادت اور جہد سالی تھی دل بھر ایکبار کے کو ٹھریوں میں پڑے رہنے یا بھاڑ جھونکنے چلانے
کے بعد جب وہ رات کو رب کی آغوش میں سوتے تو اُن کی روح کی گہرائیوں سے درد اور سوز
میں ڈوبی ہوئی صدا نکلتی "ایشور مجھ پر رحم کرو" جب ان کے پاس ثروت تھی، عیش کے
سامان تھے، جوانی تھی صحت تھی، اختیار تھا، انہیں عبادت کے لئے موقع نہ ملتا تھا، دل
ماسوا ہی کی طرف لپکتا تھا، اب محروم اور پامال ہو کر انہیں خدا کے سوا اور کہیں سہارا نہ
ملتا تھا پان پر جب تک کائی کا پردہ ہے اس میں روشنی کا گذر کہاں

سیٹھ جی مندر سے نکلے ہی تھے کہ ایک عورت نے مندر میں قدم رکھا ہوا جب مندر کا
دل اُچھل پڑا، خون کا ایک ایک قطرہ لہرا اٹھا وہ ایک لرزہ دور کی حالت میں ایک
ستون کی آڑ میں چھپ گئے، معلوم ہوا، دل کی مسرت آنکھوں سے باہر نکل پڑی ہے
یہ پرمیلا تھی

ان پندرہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جب انہیں پرمیلا کی یاد
نہ آئی ہو۔ وہ عیش اور نشاط کی تصویر ہمیشہ اُن کی نظروں کے سامنے رہی تھی، آنکھیں

(۵)

پندرہ سال کے بعد سیٹھ خوب چند اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، ہرابھرا درخت ٹھونٹھ ہو کر رہ گیا تھا، چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی، سر کے بال سن۔ ڈاڑھی جنگل کی طرح بڑھی ہوئی۔ دانت گویا کہیں کھو گئے، کمر کمان، ٹھونٹھ دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے، یہ وہی تناور درخت ہے جس کی گھنی ٹہنیوں میں چڑیاں بسیرا لیتی تھیں۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر وہ سوچنے لگے، کہاں جائیں، اپنا نام لیتے شرم آتی تھی، بھیا ابھی زندہ ہے، عاقبت کے بورئیے بٹورنے کے لئے کس سے پوچھیں، پرمیلا جیتی ہے یا مر گئی ہے اگر ہے تو کہاں ہے، انہیں دیکھ کر خوش ہوگی یا منہ پھیر لے گی۔

خوب چند کی کوٹھی ابھی تک خوب چند کی کوٹھی کہلاتی تھی، زبانِ خلق قانون کے الٹ پھیر کیا جانے، اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک پان والے سے پوچھا کیوں بھیا، یہی تو خوب چند سیٹھ کی کوٹھی ہے؟

پان والے نے ناہمدردانہ انداز سے پان لگاتے ہوئے کہا سیٹھ خوب چند کی جب تھی تب تھی۔ اب تو لالہ دلیسراج کی ہے۔

"اچھا مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے، سیٹھ جی کے یہاں نوکر تھا، سنا سیٹھ جی کو کالا پانی ہو گیا تھا"

"ہاں بیچارہ کھیل ہنسی میں مارا گیا، چاہتے تو بے داغ بچ جاتے۔ مگر نصیب، سارا گھر مٹی میں مل گیا"

"سیٹھانی تو ابھی ہوں گی!"

"ہاں سیٹھانی کیوں نہیں ہے، سیٹھ جی کا ایک لڑکا بھی ہے"

سیٹھ جی کے چہرہ پر جوانی ناچ اٹھی، زندگی کا وہ جوش اور ولولہ جو آج پندرہ سال سے کنبھ کرن کی طرح پڑا سو رہا تھا گویا نئی زندگی پاکر اٹھ بیٹھا ہے اور اس وقت

کریں، پھر تو اس بے نوائی میں بھی شاکر رہے گی، وہ دونوں ٹھاکر جی کے قدموں پر سر جھکا کر لیٹ رہے
کے لیے دعا مانگتی ہے لیکن یہ کہ ایشور اس پر مہربان ہیں، اس دنیا میں استقرار اور ہمسایہ
سکون کا احساس ہوتا رہتا ہے، دعا ہی اب اس کی امیدوں کا مرکز ہے

(۴)

ایام مصیبت امید کے سائے میں کٹ گئے ہیں پورے چودہ سال۔ شام کا وقت ہے، موہن
کرشن چندر ماں کے پاس اداس بیٹھا ہوا ہے وہ ماں کو پہچانتا ہے، ماں کو
پرملا نے اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سلجھا کر پوچھا کیوں بیٹا تمہارا
امتحان تو ختم ہو گیا۔
کرشن چندر نے مایوسانہ لہجہ سے کہا، ہاں اماں، امتحان ہو گیا لیکن میرے پرچے
اچھے نہیں ہوئے، میری طبیعت پڑھنے میں نہیں لگتی
اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، پرملا نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا، یہ تو اچھی بات نہیں
ہے بیٹا مجھے سن کر رنج ہوتا ہے
کرشن چندر نے عقیدت آمیز نظروں سے دیکھا مجھے بار بار بابو جی کی یاد آتی ہے، اب
وہ اب سب بوڑھے ہو گئے ہوں گے، میں سوچا کرتا ہوں وہ آئیں گے تو دل و جان سے
ان کی خدمت کروں گا ایسی عظیم الشان قربانی کس نے کی ہوگی، اماں اس پر بھی کچھ لوگ انہیں
بے رحم کہتے ہیں۔ میں کل مدن گوپال ماتھر کے گھر گیا ہوں اماں، ان کی ایک بیٹی ہے، اماں ہے اور
لڑکی ہے جو مجھ سے دو سال بڑی ہے ماں بیٹی دونوں اسی مل میں کام کرتی ہیں، اماں وہ
بہت لاغر سی ہو گئی ہیں
پرملا نے تعجب سے پوچھا تجھے ان کا گھر کا پتہ کیسے لگا
کرشن چندر خوش ہو کر بولا، میں ایک دن مل میں گیا تھا، میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا
جہاں مزدوروں نے بابو جی کو گھیرا تھا اور وہ جگہ بھی جہاں گوپی ناتھ گولی کا شکار ہوا تھا

وغیرہ، عدالت کو اب سزا دینے کے سوا چارہ نہ رہا، اور سیٹھ جی کو حبس دوام کی سزا ملی۔

سیٹھ جی کے جاتے ہی تنول اور ثروت کی دیوی بھی روٹھ گئی۔ مل تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا، لینا دینا چکانے کے بعد معلوم ہوا، یہ شان و شکوہ محض طلسم تھا، ان طلسموں میں سے ایک جو بڑے بڑے مہاجن آئے دن باندھتے رہتے ہیں، جس کی بدولت وہ ہوا میں محل کھڑے کر دیتے ہیں، پانی پر نقش بنا دیتے ہیں، ساری دنیا کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر تاریک کو روشن دکھا سکتے ہیں، مگر خوش چند کا یہ طلسم ٹوٹا تو گھر بھی سلامت نہ بچا، پرمیلا کے پاس اب بھی ہزاروں کے زیور تھے، اس کے گذارہ کے لئے یہ اثاثہ بھی کافی تھا۔ مگر شوہر کے نام کی لاج تو رکھنی تھی کسی کو انگشت نمائی کا موقع کیوں ملے، اس نے زیور بھی بیچ ڈالے اور سب دینے چکا دیئے، وہ حاملہ تھی، جب پرماتما نے اس پر اتنا رحم کیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دی تو وہ کیوں نہ خوش معاملہ بنے، کیوں نہ سب کچھ پرماتما کے قدموں پہ ہی نثار کر دے، ساتویں مہینے جب روز سعید آیا تو پرمیلا ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں تھی، مگر یہ نعمت پاکر وہ ساری مصیبتیں بھول گئی، اب وہ سب کچھ خوشی سے جھیل لے گی، اس تنکے کے سہارے وہ اپنی کشتی کنارے پر پہنچا دے گی، جس کی نیک نیتی سے اس نے شوہر کے قرضے ادا کئے تھے اس سے لوگوں کو اس کے ساتھ حسن اعتقاد ہو گیا تھا، کچھ لوگ تو اُسے ماہوار وثیقہ دینے پر بھی آمادہ تھے، لیکن پرمیلا نے کسی کا احسان نہ لیا، شریف گھرانوں میں اس کی رسائی تھی ہی، وہ ان گھروں میں سُدیشی چیزیں مہیا کر کے اپنے گذر بھر کو کما لیتی، جب تک بچہ دودھ پیتا تھا اُسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد وہ آزاد ہو گئی، بچے کو دائی کے سپرد کر کے وہ معاش کی فکر میں نکل جاتی اور دن بھر کی دوا دوش کے بعد جب وہ شام کو گھر آتی اور بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی، تو اس کا دل مسرت سے پھول اٹھتا، اور عالم خیال میں وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاتی، اُسے دولت کے لُٹ جانے کا ذرا بھر غم نہیں ہے، ایشور نے اس کی تلافی کر دی ہے، اب اس کی اتنی ہی آرزو ہے کہ سیٹھ جی زندہ و سلامت لوٹ آئیں اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی

کے دروازہ پر مظاہرہ کرنے آ رہے تھے۔ سیٹھ جی نے شور سنا اور اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا
پریملا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، مہاشے آگے باہر جو نکلی ہوں، پھر آ جاؤ، مزدور تمہیں
دیکھ لیں گے تو اور بھی طوفان مچائیں گے

سیٹھ جی نے ہاتھ چھڑا لیا اور بولے میں چھپا نہیں چاہتا، میں نے ایک بے گناہ کو قتل
کیا ہے اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے، اس نے جان گنوائی کہ میں نے دولت جمع کی ہے اور میں
حاصل کی ہے اگرچہ مجھ سے زیادہ بدقسمت تھا مجھ سے زیادہ معزز تھا۔ میں نے اس کا خون
کیا ہے، دیکھو تو نہیں مزدوروں کے پیچھے ہے مسلح پولیس، مزدور سب دروازہ پر آ کر کیا
کریں گے، شاید میرے گھر میں آگ لگا دیں لوٹ مچا دیں پولیس ان پر گولی چلائے گی، انہیں
میں اپنی جان بچانے کے لئے بے شمار جانیں نہ لوں گا مزدور میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے
پولیس کے ہاتھوں میں دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا، شاید تم سے پھر ملاقات نہ ہو،
مجھے معاف کرنا، تمہیں اللہ کو سونپا ۔

وہ زینے کی طرف چلے، پریملا ان کے پیچھے دوڑی، مگر سیٹھ جی نکل گئے اور پریملا وہیں کھڑی
روتی رہ گئی

(۳)

مگر خود اپنے جرم کا اعتراف کر دیتا ہو تو وکیل اور بیرسٹر کیا کر سکے، سارا شہر عدالت میں امڈا
اور سیٹھ کا بیان سن کر دانتوں میں انگلی دبا لیتا تھا کچھ لوگ ان کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے
تھے، زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں خلل دماغ ہو گیا ہے صفائی کے بیرسٹر نے بڑی کوشش
کی کہ سیٹھ جی سے یہ کہلائیں کہ انہوں نے اپنی حفاظت میں ریوالور چلایا لیکن سیٹھ جی نے کسی
طرح تسلیم نہ کیا، ایک ماہر نفسیات نے لکھا کہ زندہ اور گنہگار دونوں میں ہی دماغی توازن کے اختلال
ہیں جب کوئی مشین بگڑ جاتی ہے تو وہ یا تو بالکل بند ہو جاتی ہے یا اس کی رفتار سے چلنے لگتی ہے
سرسام کا مریض اس اختلال کی ایک مثال ہے یا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا یا حرکت بھی نہ کر سکے گا

ہیں، اب کوئی ان سے بول نہیں سکتا، شہید کی تحریک میں یہ اثر ہے۔
سیٹھ جی کار پر بیٹھے، اور گوپی ناتھ زمین پر گر پڑا۔ اور پھر نہ اٹھا۔

(۳)

سیٹھ جی کی کار جتنی تیزی سے اڑی جارہی تھی، اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے گوپی ناتھ کی تصویر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے دوڑتی چلی آتی تھی، اگر گوپی اُن کا دشمن تھا تو اس نے ان کی جان کیوں بچائی، اور ایسی حالت میں جب وہ خود مر رہا تھا۔ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا بے گناہ جیسے ہاتھ باندھے ہوئے ان کے روبرو کھڑا کہہ رہا تھا، آپ نے مجھ بے گناہ کو کیوں مارا؟

نفس کے بندے بالعموم للہیت احساسات سے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن سیٹھ جی کا ضمیر اتنا بے حس نہ ہوا تھا، کہ ایک بے گناہ کا خون کر کے انہیں افسوس نہ ہوتا، وہ گھر پہنچے تو اُن کے چہرہ پر وحشت چھائی ہوئی تھی، مسند پر لیٹ گئے، اور ایک لمبی سانس کھینچ کر پرمیلا سے بولے بڑا غضب ہو گیا، پرمیلا میں نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا، وہی گوپی جو مزدوروں کا سردار تھا معلوم نہیں کیوں مزدوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا۔ اور گوپی پر دبا اور چھوڑ دیا، حالانکہ اُس غریب نے آخر دم تک مجھے بچانے کی کوشش کی اور اُسی کے سمجھانے کا یہ اثر ہے کہ مزدوروں نے مجھے یہاں تک آنے دیا، مجھے تو معلوم ہوتا ہے وہ کوئی دیوتا تھا، ضرور مر گیا ہوگا۔ حالانکہ زخم بازو میں تھا مگر وہ بچے گا نہیں میں کار پر بیٹھا ہوں تو میں نے اُسے گرتے دیکھا، میں نے اُسے قتل کر دیا، مجھے سمجھانے آرہا تھا۔

سیٹھ جی کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھیں مشتعل ہو گئیں، زور زور سے سانس کھینچنے لگے پیشانی پر عرق کے قطرے جھلک پڑے، بولے ذرا پنکھا کھول دو، بڑی گرمی لگ رہی ہے جسم پھنکا جاتا ہے اب مجھ سے نہیں رہا جاتا، میں جا کر پولیس میں اپنے جرم کا اقبال کروں گا، میں نے گوپی کو بے گناہ مارا، بالکل بے گناہ۔

• باہر شور ہو رہا تھا، گوپی کے مرتے ہی مزدوروں نے اس کا جلوس نکالا تھا اور سیٹھ جی کے

لے کھڑے ہیں، کہیں سے کوئی مدد نہیں آ رہی ہے، ہر لمحہ زندگی کی امید میں بزدلی چھاتی ہے، پچھتا رہے ہیں کہ سیٹھ جی کیوں نہ لٹ جانا، ایک ایک کو ڈھونڈ کر رکھ دیتا، مگر کیا معلوم تھا اس مصیبت کا سامنا ہوگا

دفعتاً ہی ایک نوجوان پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہوگیا، اس کے ہاتھوں میں بیڑی بندھی ہوئی تھی، اور بخار جاری تھا، اس کا چہرہ زرد سے خاکستر ہوگیا تھا، اور اشارات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ درد سے بے چین ہے، اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اسے مارنا سیٹھ جی کو قتل کرنے سے زیادہ اہم تھا، اس ہجوم کے ہجوں میں بھی اپنے سردار کو چھپا لیا، دیکھ کر ان کے دل تشکر سے پُر ہوگئے، ایک فلک دوز نعرہ بلند ہوا، "گوپی ناتھ کی جے"

دھنی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کرکے ضعیف آواز میں کہا، میں ایک بدنصیب لوگوں کا ادنیٰ ہوں، تھا سو شاید پھر تم مجھے نہ دیکھو، اس لئے میری التجا ہے یہ آخری التجا ہے کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو، میرا کہنا مانو اگر سیٹھ جی کا مال لٹ گیا تو میری آتما کو وہاں بھی چین نہ آئے گا،

لوگوں نے اعتراض کئے، سرگوشیاں کیں، مخالفانہ آوازے بھی کسے لیکن گوپی ناتھ کا حکم کیسے ٹالیں جس نے انہیں کے لئے اپنی زندگی قربان کردی

میدان صاف ہونے لگا، صرف تھوڑے سے جان نثار باقی رہ گئے، تو گوپی ناتھ نے سیٹھ جی سے عاجزی کے ساتھ کہا۔

"سرکار اب آپ چلے جائیں، میں جاتا ہوں، آپ نے گھبراہٹ میں مجھے ملازمت سے برطرف کیا تھا وہ بھی آپ سے یہی بات کہنے جا رہا تھا جو اب کہہ رہا ہوں مگر بھگوان کی مرضی۔"

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے کچھ عقیدت ہوگئی، پہلے اُن کے اندر کچھ تذبذب ضرور تھا لیکن اب بھی نوجوان کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ادھر اُدھر چوکس نظروں سے تاکتے ہوئے وہ اُترے ابھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے تھے، ہر ایک کی آنکھوں میں اشتعال ہر کچھ لوگ کشت کلائی کر رہے

جان ہتھیلیوں پر لئے ہوں۔

سیٹھ جی نے کار سے اترتے ہی کانسٹبلوں کو حکم دیا "ان بدمعاشوں کو مار کر بھگا دو"

فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے پڑنے لگے، دس پانچ تو گر پڑے، باقی اپنی جانیں لے کر بھاگے

نوجوان سرغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا تھا۔

تردت میں اتنا تحمل کہاں، سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے، کانسٹبلوں نے ان تینوں آدمیوں کی گردن ناپی، حراست میں لے لیا، اور لاری کی طرف لے چلے، جو اسی لئے لائی گئی تھی

ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آپہنچا اور انہیں رہا کرانے کے لئے مصر ہوا، کانسٹبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا، انہیں چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے، سیٹھ جی نے دانت پیس لئے، ایک ہی لمحہ میں صورت حال میں اتنا تغیر ہو جائے گا اس کا انہیں گمان نہ تھا، اب وہ تنہا ہیں، اور ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ، صرف ریوالور ان کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا، سیٹھ جی کے اوسان خطا ہو گئے، موقع ومحل کا امتیاز نہ رہا، سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آرہے ہیں، نوجوان کی طرف نشانہ کیا اور ریوالور داغ دیا، وہ لڑکھڑایا، اور زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مزدوروں کے سر پر جیسے خون سوار ہو گیا، اس کے قبل تک ان میں اہنسا (تشدد) کا شائبہ بھی نہ تھا، وہ منظم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ آپ ہماری مزدوری کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے، لیکن اہنسا نے ہنسا کو مشتعل کر دیا، سب کے سب قاتلانہ ارادہ سے سیٹھ جی کی طرف لپکے، گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اسے ملے، سیٹھ جی نے دیکھا، ہموار زمین پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے، مگر بھاگنے کا کہیں راستہ نہ تھا، جب کچھ نہ سوجھا تو وہ روئی کی گانٹھوں پر چڑھ گئے، اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے والوں کو اوپر چڑھنے سے روکنے لگے، نیچے پانچ چھ سو آدمیوں کا محاصرہ ہے، اوپر سیٹھ جی تنہا ریوالور

لے کھڑے ہیں، کہیں سے کوئی مدد نہیں آ رہی ہے، ہر طور زندگی کی امید لیے میں ڈوبی جاتی
ہے، پچھتا رہے ہیں کہ صندوق کیوں نہ لیتا آیا، ایک ایک کو کھول کر رکھ دیتا، مگر کیا معلوم تھا
اس مصیبت کا سامنا ہوگا

دفعتاً ہی ایک نوجوان پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہو گیا، اس کے ہاتھوں میں بھی صندوق
کھولی تھی، اور خون جاری تھا، اس کا چہرہ درد سے ماکسر ہو گیا تھا، اور اشارے سے ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ وہ درد سے بے چین ہے۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا، یہ تھا سیٹھ جی کو سنبل
کیسے دینا والا اہم تھا، اس جہالت کے جنون میں بھی لوگ سردار کو پہچان گئے، دیکھنے والوں کے دل تشکر
سے لبریز ہوگئے، ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا، جے گوپی ناتھ کی جے۔"

زخمی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کر کے ضعیف آواز میں کہا "بہنو بھائیو، لوگو اور بہنو
ہوں تھا سو شاید پھر تم مجھے نہ دیکھو، اس لیے میری التجا ہے، یہ آخری التجا ہے کہ تم لوگ
اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو، میرا کہنا مانو، اگر سیٹھ جی کا مال لٹ گیا تو میری آتما کو
وہاں بھی چین نہ آئے گا،

لوگوں نے اعتراض کیے، سرگوشیاں کیں، مطالبہ کرانے بھی کیسے لیکن گوپی ناتھ کا حکم
کیسے ٹالیں جس نے انہیں کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی

میدان صاف ہونے لگا، صرف تھوڑے سے جاں نثار رہ گئے، تو گوپی ناتھ نے
سیٹھ جی سے عاجزی کے ساتھ کہا

سرکار اب آپ چلے جائیں، میں جاتا ہوں، آپ نے گھبراہٹ میں مجھے ملا، میں اس
وقت بھی آپ سے یہی بات کہنے جا رہا تھا جو اب کہہ رہا ہوں مگر بھگوان کی مرضی۔

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی اس میں کچھ اندیشہ ضرور تھا لیکن اور
بھی لوگ جان بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ادھر ادھر حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے وہ اُٹھے
اب بھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے ہیں، ہر ایک کی آنکھوں میں اشتعال بھرا، کچھ لوگ تلخ کلامی بھی کر رہے

جان ہتھیلیوں پر لئے ہوں۔

سیٹھ جی نے کار سے اترتے ہی کانسٹبلوں کو حکم دیا "ان بدمعاشوں کو مار کر
فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے پڑنے لگے، دس پانچ تو گر پڑے، باقی اپنی جانیں لے کر
نوجوان سرغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا تھا۔

ثروت میں اتنا تحمل کہاں، سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے، کانسٹبلوں نے ان تینوں
آدمیوں کی گردن ناپی، حراست میں لے لیا، اور لاری کی طرف لے چلے جو ابھی لائی گئی
ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آپہنچا اور انہیں
کرانے کے لئے مصر ہوا، کانسٹبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا، انہیں
چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے، سیٹھ جی نے دانت پیس لئے، ایک ہی لمحہ میں صورت
میں اتنا تغیر ہو جائے گا اس کا انہیں گمان نہ تھا، اب وہ تنہا ہیں، اور ایک ہزار آدمی
کا مقابلہ، صرف ریوالور کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا، سیٹھ جی کے اوسان خطا
موقع و محل کا امتیاز نہ رہا، سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آرہے ہیں، نوجوان کی طرف
کیا اور ریوالور داغ دیا، وہ لڑکھڑایا، اور زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مزدوروں کے سر پر جیسے خون سوار ہو گیا، اس کے قبل تک ان میں
(تشدد) کا شائبہ بھی نہ تھا، وہ منظم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ آپ ہماری مزدو
کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے، لیکن اہنسا نے ہنسا کو مشتعل کر دیا، سب کے سب قاتلانہ ا
سے سیٹھ جی کی طرف لپکے، گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اسے ملے، سیٹھ
جی نے دیکھا، ہموار زمین پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے، مگر بھاگنے کا کہیں را
نہ تھا، جب کچھ نہ سوجھا تو وہ روئی کی گانٹھوں پر چڑھ گئے، اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے وا
کو اوپر چڑھنے سے روکنے لگے، نیچے پانچ چھ سو آدمیوں کا محاصرہ ہے، اور سیٹھ جی تنہا

کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان بھی کر دیا ہے کیونکہ علاوہ ان ہو گیا ہے
اور سستی مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے بھیج چلے
آ رہے ہیں کھسک کا اعلان بھی پہلے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ تھا

صبح کا وقت ہے مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے، بعض لیڈر کانسٹبلوں
کا پہرا مل میں پوری ہڑتال ہے، مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت
کی مگر سیٹھ جی رہے

اس وقت بھی سرغنہ سیٹھ جی کے پاس آخری شرطیں لے کر گیا ہے لوگ اس کی واپسی
کا انتظار کر رہے ہیں ایک نوجوان سا رندہ سائیکل پر دوڑا ہوا احاطہ کے سامنے آیا،
مزدوروں نے چاروں طرف سے آکر اسے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی یہ لمبا دبلا
سانولا نوجوان بھی مزدوروں کا سرغنہ ہے

اس نے مایوسانہ انداز سے کہا سیٹھ جی بالکل سماعت نہیں کرتے، تو پھر ہم کیوں یا
کیوں سامنا کریں ہڑتال سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور ہم بھوکوں مر جائیں گے، لیکن ہم خود جان دیں
دوسروں کے لیے استعفا دے دیں گے ہم خود مریں گے تاکہ دوسرے جئیں دو سو روزگی میں
ایسے موقعے بھی آتے ہیں۔ سب مر جانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے۔ نئے آدمیوں کی بھرتی
شروع ہو گئی ہے آج ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل میں گھسنے نہیں دیں گے
چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں گولیاں برسیں یا کچھ ہو

ایک طرف سے آواز آئی "سیٹھ جی آگئے سیٹھ جی آگئے"

سبھی پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے، چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں کیسے ہی لوگ جو تیار
ہو کر کانسٹبلوں سے لڑ کے اندر جانے کے لیے سب کرنے لگے کچھ لوگ دبی کی بگیا کی آڑ
میں جا چھپے خود سارا دن پہلے دل سے آگے بڑھیں اور مزدوروں کے ہجوم کے ساتھ اندر رہ جا
سکے نہیں صرف مٹھی بھر آدمی پیچھے رہ گئے سے نوجوان سرغنہ کے ساتھ کھڑے رہے گویا اپنی

فارغ ہو کر۔

پجاری کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر بولے، دیکھتے نہیں ہو کیا کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک کام ہے کھیل نہیں ہے، تمہارے ٹھاکر جی ہی سب کچھ نہ دے دیں گے، پیٹ بھرنے پر ہی پوجا پاٹ بھی سوجھتی ہے، گھنٹے دو گھنٹے کی دیر ہو جانے سے ٹھاکر جی بھوکوں نہ مر جائیں گے اور نہ ٹھنڈا بھوگ انہیں بدہضمی کرے گا۔

پجاری اپنا سا منہ لے کر چلا گیا، اور سیٹھ جی پھر ڈالیاں سجانے میں مصروف ہو گئے۔

ایک ہی منٹ بعد ان کے ایک خاص دوست لالہ کیشو رام تشریف لائے، خوب چند اٹھ کر ان کے گلے لپٹ گئے، اور پوچھا کدھر سے؟ میں تو ابھی تمہیں بلانے والا تھا۔

کیشو رام نے مسکرا کر کہا، اتنی رات تک ڈالیاں ہی لگ رہی ہیں، بھلے آدمی اب تو سمیٹو، کل کا سارا دن پڑا ہے، لگا لینا، اور ان ڈالیوں سے ہوتا کیا ہے، مفت کی زحمت آج کیا پروگرام تھا، یاد ہے؟

خوب چند نے گردن اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی (کیا کوئی خاص پروگرام تھا دیکا یک حافظہ بیدار ہو جاتا ہے)۔

"اچھا وہ بات، ہاں یاد آگیا، ابھی تو دیر نہیں ہوئی۔"

"تو چلو پھر میں نے تو سمجھا تھا، تم وہاں پہنچ گئے ہو گے۔"

"لیلا ناراض تو نہ ہو گی۔"

"یہ تو وہاں پہنچنے پر معلوم ہو گا۔"

"تم میری طرف سے معذرت کر دینا۔"

(۲)

سیٹھ جی کا سودیشی مِل ممتاز ملوں میں ہے، جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے مال کی کھپت دونی ہو گئی ہے۔ اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے، اور اس

ڈامل کا قیدی

(۱)

دس بجے رات کا وقت، ایک عالیشان محل میں ایک سجا ہوا کمرہ، صاف ستھرا فرش،
مسند تکیے، بجلی کی انگیٹھی، بجلی کی روشنی، کرسمس کے ایام ہیں، سخت کی سردی پڑ رہی ہے
سیٹھ خوب چند افسروں کی خدمت میں ڈالیاں بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ پھلوں، میووں
کیلوں، مٹھائیوں اور کھلونوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے سامنے لگی ہیں۔ منشی جی ایک
پوتھے میں سب افسروں کے نام بولتے جاتے ہیں اور سیٹھ جی اپنے ہاتھوں سے حسب حیثیت
ڈالیاں لگاتے جاتے ہیں۔ مخملی چادر، وہی پرانا سا ایک کالا کوٹ پہنے ہوئے
خوب چند ایک مل کے مالک ہیں اور بمبئی کے بڑے کمرشل لیڈر، ایک مدت سے میونسپلٹی کے ممبر ہوتے چلے
آ رہے ہیں، اس وقت بھی کئی کارخانوں کے سکریٹری اور صدر ہیں، وہ شہر کے باعزت اور ذی ثروت کس
مدنگیں ڈالیوں کا طفیل سے کیوں جائے، مگر اس عمر میں ان کے دس پانچ ہزار روپے صرف ہو جاتے
ہیں۔ اور سیٹھ جی کی آمدنی ایسی ڈال دینے والے انسان نہیں ہیں۔ ان کے چہرے سے ان کی کاروباری
صاف جھلک رہی ہے۔ اگرچہ ان کا ایمان خوشامدی ڈوبی، مگر حضور، ان کبھی سے لوگ ہیں اور ماڈرن
کے سیٹھ جی تاجروں میں ایسا تھا کہ کام لیا حاصل کرنے کے پیسے بھی تھے
پجاری نے آکر عرض کی، "سرکار بڑی دیر ہو گئی، ٹھاکر جی کا بھوگ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
مالدار اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنوایا تھا۔ ٹھاکر جی کی پوجا کرنے
کے لئے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا اور صدقہ وقف کیا کرتے تھے، ہاں کر و دیکھ کے رسیدوں سے

زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی وہ ہل گئی ہو۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض سراب تھا، محض خواب، نفس کی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس زاہدانہ اجتہاد میں اس کی وہ پر ارمان اور پر اشتیاق محبت فنا ہو گئی، اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے، پورنما اسی طرح وہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اُس نے احترام کے لہجہ میں کہا، تپسوی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھ سکتے ہیں، ہوسی ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے۔ سمجھانا نہیں۔

اور پورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ تمہارا بچہ ابھی تک تمہیں پوچھا کرتا ہے۔

رنج نہ ہوا، وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اس خبیث شوہر کے ساتھ پورنما کی زندگی قابل رشک نہیں ہو سکتی۔ فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے کبھی اپنے سوزِ جگر کا اظہار نہ کیا، مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البالی کے باوجود اسے اس مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے، جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں، ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہو جاتے۔ اس کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہو گئیں۔ اب اس میں وہ پہلے کی جھجک نہیں ہے، اس کی زبان پر نہ وہ مہر خموشی ہے اور پورنما بھی اب آزاد ہے، تقاضائے سن نے یقیناً اسے زیادہ مہرپرور بنا دیا ہوگا۔ وہ شوخی اور البھڑپن اور بے نیازی نوک کی رخصت ہو چکی ہوگی۔ اس دوشیزگی کی جگہ اب آر۔ وہ کار نسائیت ہوگی۔ جو محبت کی قدر کرتی ہے اور اس کی طلبگار رہوتی ہے، وہ پورنما کے گھر ماتم پرسی کرنے جائے گا۔ اور اسے اپنے ساتھ لائے گا اور اس کے امکان میں اس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا۔ اب اسے پورنما کے محض قرب سے تشفی ہو جائے گی، وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تسکین پائے گا کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے۔ بیس سال پہلے اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی، وہ بھرا ہوا جسم۔ وہ رخساروں کی سرخی، وہ ملاحت، وہ اس کی کھچی ہوئی ٹھڈی۔ جس میں امرت سے بھرا ہوا حوض تھا وہ اس کی نشہ انگیز مسکراہٹ، وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھی اور وہ تغیر تخیل کی آنکھوں میں اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ضرور زمانہ کی بیداریوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا جس سے اس کی دلفریبی میں فرق آ جائے۔ اور اب وہ ظاہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا جتنا اس کی سخنہائے شیریں کا، اس کی نگاہِ محبت کا اس کے اعتماد کا اور مردانہ خودپروری کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے ناآسودہ ذوقِ محبت کو اپنی نازبرداریوں اور گرمجوشیوں سے محظوظ کرے گا۔ اور اپنی پہلی فروگذاشتوں کی تلافی کر دے گا۔

اور پورنما کے آکر بلانے پر بھی اس کے سامنے نہ جاتا۔

امرت پوچھتا۔ تم کس کے بیٹے ہو۔

بچہ کہتا۔ تمہارے۔

اور امرت مسرت سے متوالا ہو کر اسے جگر سے چمٹا لیتا۔

پورنما کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھل کر پھول ہو گئی تھی، اب اس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی، اور سنگار سے عشق، طلائی زیوروں سے سج کر اور ریشمی ساڑی پہن کر اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر ہو گئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا، امرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے۔ بلا کسی خاص ضرورت کے اس سے بہت کم بولتی۔ اور وہ بھی اس انداز سے گویا اس پر کوئی احسان کر رہی ہو، امرت اس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کتنی تندہی سے تعمیل کرتا ہے بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی، گویا یہ امرت کا فرض ہے اور اسے ادا کرنا چاہیئے، اس کے لئے وہ کسی شکریہ اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا ہے تو وہ دھمکاتی ہے، خبردار رونا نہیں۔ ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے

اور بچہ خاموش ہو جاتا۔

اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز سے کہہ دیتی ہے اور امرت فوراً تعمیل کرتا ہے۔ گویا اس کا غلام ہو۔ اور وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اس نے امرت سے غلامی لکھا لی ہے۔

چھ مہینے میکے رہ کر پورنما سسرال چلی گئی، امرت اسے پہنچانے اسٹیشن تک آیا، جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تب امرت نے بچہ کو اس کی گود میں دے دیا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی بوند ٹپک پڑی، اس نے منہ پھیر لیا، اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالا۔ پورنما کو اپنے آنسو کیسے دکھاتے کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ مگر دل نہ مانتا تھا، نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

پورنما نے تمکنت کے ساتھ کہا، بچہ کئی دن تک تمہارے لئے بہت ہڑکے گا۔

پورنما کی شادی ہو گئی۔ امرت دل و جان سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا۔ ولولہ اور جوش
تھا تو دل میں مگر وہ اس کے ساتھ ہی بڑا مغرور سادہ مزاج ملک امرت اس بھاگ سے اس کی
خاطر داری کر رہا تھا گویا وہ کوئی دولت ہے اور اس کا ایک قسم لے جنت میں کھیلنے کا۔ چونکہ
ملنے جلنے کا امرت کو موقع نہ ملا اور اس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورنما کو
جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبان خاموش سے ہمدردی و دلجوئی اعتقاد کی
اور تشفی ممکن بھی وہ کرتا رہتا تھا

تیسرے دن پورنما رو دھو کر رخصت ہو گئی۔ امرت نے اس دن اسپورٹس میں جا کر
بھی جیو دیپ سے کھڑے ہوتے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے، اس کی زندگی میں عالم
عاقبت کا کہاں گذر، تم پورن جانی امرت کا امر الہ ہے، مگر دل کے اندر ایک بے گمر ہوتے
ہی اندھیرا کا احساس ہو رہا تھا، گویا اب زندگی ویران ہے اس کا کوئی مقصد اور
مدعا نہیں

تین سال کے بعد پورنما پھر میکے آئی۔ اس عرصے میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی
اور وہ زندگی کا خوگر دل سے گھر بسانا چلا جا رہا تھا، مگر ایک موہوم سی بساط کی کوئی صلح
صورت وہ نہ پا سکا تھا۔ پھر ہمیشہ کے پاپ کی طرح اس کے اندر کچھ کا بھی پور نکلتا، اگر اس
میں ہر لے ڈال دی ماند پانچ چڑھ کر سر سال کی حد تک جا پہنچا۔ اس کی گود میں ایک سال کا
پیارا سا بچہ تھا۔ امرت اس بچے کو سارے دن گلے لگائے رہتا، صبح و شام اسے گود میں لے کر
ٹہلانے لے جاتا۔ اس کے لئے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا۔ صبح ہوتے
ہی اس کے پاس کے لئے حلوا اور میوے لے کر پہنچ جاتا۔ اسے سو کر دھلاتا، اس کے گال چوما کرتا
اس کے چھوٹے ہاتھوں کو دھو کر مرہم رکھتا۔ ساری محبت اس نے اپنے دل سے لٹا دی، بچہ بھی
اس کا اتنا ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا گلا نہ چھوڑتا، یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سو جاتا

کبھی کبھی محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا، گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے ان لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں، کاش ان آنکھوں میں وار پار دیکھنے کی طاقت ہوتی اس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں۔ گویا شادی ہوتے ہی اُن کی جان پر بن جائے گی۔ مگر سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے کپڑے پہن کر ڈولی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے اس کی کچھ تشفی نہ ہوئی پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔ اب تمہیں میری یاد کیوں آئے گی۔

اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا، ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرہ سے باہر بھاگ جائے پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ کہیں وہ سمجھ تو گئی ہو۔

پورنما نے سر جھکا کر جلیے اپنے دل سے کہا، تم مجھے اتنی نرموہنی سمجھتے ہو۔ تم جو کچھ سب تصور رکھتے ہو، تمہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنی چاہیئے مجھے تسکین دینی چاہیئے اور تم مجھ سے تنے بیٹھے ہو، تمہیں بتاؤ، میرے لئے دوسرا کون سا راستہ ہے، اپنے بچے بعزرجہ کے لمز بھیج دے رہے ہیں وہاں مجھ پر کیا گذرے گی، میری کیا حالت ہوگی، یہ غم میری جان لینے کے لئے کافی نہیں ہے کہ تم اس میں اپنا غصہ بھی حل کر دو۔

اس کا گلا بھر بھر آیا، آج امرت کو اس حالت میں پورنما کے سوزِ نہاں کا یقین ہوا اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرہ پر جھلکنے لگی، پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت تھی، اور کتنی سرزنش اور کتنا اپنا پن، غیروں سے کوئی کیوں شکوہ کرے، بیشک اس حالت میں اسے پورنما کی دلجوئی کرنی چاہیئے تھی، یہ اس کا فرض تھا، اور اسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہیئے تھا، پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھ دیا، اور اس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا بے شک محبت ایک بے نفس قربانی ہے، طویل اور جگر دوز۔

اس نے پشیمان ہو کر کہا۔ مجھے معاف کرو پورنما! میری غلطی تھی، بلکہ حماقت

"میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمہیں کیسے دیکھوں گی اور تم کیوں میرے گھر آؤ گے ؟"

امرت نے گھبرا کر پوچھا۔ کہاں چلی جاؤ گی تم ؟

پورنما لجا گئی، پھر بولی جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں، جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔

امرت نے حسرت کے ساتھ کہا، اچھا وہ بات اور خاموش ہو گیا اس وقت تک یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی، کہ پورنما کہیں چلی بھی جائے گی، اتنی دور تک سوچنے کی اسے مہلت ہی نہ تھی، مسرت تو حال ہی میں مست رہتی ہے، آئندہ کی سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔

اور یہ سانحہ اس قدر جلد رونما ہو گیا جس کا امرت کو گمان ہو سکتا۔ پورنما کے لیے ایک پیغام آ گیا متمول خاندان تھا اور ذی عزت، پورنما کی ماں نے اسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ عسرت کی اس حالت میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کیلئے فارغ البال زندگی کے لئے سارے سامان موجود تھے، اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی، فکروں سے کھلی جاتی تھی لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی انتزاع قلب ہونے لگتا تھا، گویا غیب نے ابرو کی ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا

امرت نے سنا تو دیوانہ ہو گیا اسے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا، مگر پھر لوٹ پڑا، ہوش نے پاؤں روک دیئے، کیا فائدہ، اس کی کیا خطا؟ کسی کی بھی کیا خطا؟ اپنے گھر آیا، اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا پورنما چلی جائے گی، پھر وہ کیسے رہے گا۔ ہیجان سا ہونے لگا۔ وہ زندہ ہی کیوں رہے، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے، مگر یہ ہیجان بھی فرو ہو گیا، اور اس کی جگہ لی اس سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے۔ وہ بے نیاز ہو گیا، جب پورنما جاتی ہے تو وہ اب اس سے کیوں کوئی تعلق رکھے، کیوں ملے جلے اور اب پورنما کو اس کی پرواہ ہی کیوں ہونے لگی اور پرواہ تھی ہی کب، وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا، پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جا رہی ہے، شوق سے بنے، امرت بھی زندہ رہے گا، مرے گا نہیں یہی اس زمانہ کی رسم وفا ہے۔

وہ بار بار امرت کے دل میں سرایت ہی رہا پورنما کو اس کی نظروں سے باتوں سے
یا چیانے سے کبھی یہ وہم بھی ہوا کہ امرت کو اس سے معمولی آداب ہمسائیگی اور کمسنی کی رفاقت
کے سوا اور کوئی تعلق بھی ہے یا ہوسکتا ہے۔ ٹھیک جب وہ گھڑا لے کر کنویں پر پانی کھینچنے
جاتی تو امرت معلوم نہ کہاں سے آ ملتا اور گھڑا اس کے ہاتھ سے لے کر پانی کھینچ دیتا
جب وہ اپنی گائے کو سانی دے رہی ہوتی تو وہ اس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکری لے لیتا اور بھوسہ
کی ناند میں سانی ڈال دیتا۔ جب کبھی دکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت لپک کر مل جاتا اور
اس کا کام کر دیتا

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا۔ اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا
تھا اور اس پورے گھر میں وہ بسی تھی۔ امرت پڑھنے جانے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا بازار
سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔ اس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ دو گائیں، بھینس بھی پال رکھی
تھے، گھر والوں کی نظر بچا کر وہ اصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے آتا، مگر پورنما
ان خاطر داریوں کو اس کی شرافت اور ہمسائیگی کے سوا اور کیا سمجھے۔ اور کیوں سمجھے۔ ایک گاؤں میں
رہنے والے چاہے جو تعلق نہ رکھتے ہوں مگر گاؤں کے رشتے سے بس بھائی بہن ہی ہیں
ان خاطر داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی

ایک دن پورنما نے اس سے کہا بھی تم دن بھر مدرسہ رہتے ہو میرا جی گھبراتا ہے
امرت نے سادگی سے کہا کیا کروں امتحان قریب ہے

آج ذرا اندھیرا تھا، پر یہ کوئی کھٹکنے والی بات نہ تھی۔ شبہ تو جب ہوا جب آٹھ بج گئے اور وہ لوٹ کر نہ آئی۔ تیسرے پہر تک ساری برادری میں خبر پھیل گئی "سیٹھ رام ناتھ کی کنیا گنگا میں ڈوب گئی" اس کی لاش معائنہ کے لئے پولیس اٹھا لے گئی۔

کبیر داس بولے چلو جھگڑا پاک ہوا۔ برادری کی بدنامی تو نہ ہوگی۔

جھابرمل نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ میں تو لٹ گیا سیٹھ جی، میرے لئے اب کوئی اور راستہ نکالئے۔

ادھر موہن سر پیٹ پیٹ کر رو رہا تھا۔ اور بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی بیٹا اس دیوی کے لئے کیوں رو رہے ہو، زندگی میں اس کے لئے کون سا سکھ تھا۔ اب وہ اپنی ماں کی گود میں آرام کر رہی ہے، ان پنچوں کا ستیاناس ہو جائے، میری لاڈلی کی جان ہی لے کر چھوڑی۔

موہن معصومانہ سادگی سے بولا۔ یہ لوگ تیا کو کیوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اماں میری خبر کیوں نہیں لیتے۔ میری پڑھائی کا کیوں انتظام نہیں کرتے؟

بڑھیا نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور پیار سے بولی، تم میری آنکھوں کے تارے ہو بیٹا۔

کو راضی کیا ہے کہتے تھے ، ایسی بلّی چھوکری سے شادی کرکے کون بدنامی مول لے مگر ہم نے بہت سمجھا بجھا کر انہیں سیدھا کیا ہے ، بس یہ سمجھ لے کہ بھاگ جاگ جائیں گے ، لاکھوں کی جائداد ہے ، اکلوتا کی ، تیرے دھن بھاگ کہ ایسا بر ملا ، تیرا چھوٹا بھائی ہے اسے بھی پڑھا لکھا کر کوئی دکان کرا دی جائے گی ۔

سیٹھ نے پیشانی کو اوپر چڑھا کر کہا ۔ برادری کی کتنی ہنسی ہو رہی ہے ۔

سیٹھانی نے تصدیق کی ۔ ہے ہی ۔

ریوتی نے لجا کر کہا ، میں کیا جانوں ، یہ سب آپ ماما سے کہیں ۔

کبیر داس بگڑ کر بولے ، ماما کون ہوتا ہے ، ٹکے کا آدمی ، اس سے میں کیا پوچھوں ۔ میں برادری کا پنچ ہوں ۔ مجھے اختیار ہے کہ جس کام میں برادری کی بہتری دیکھوں وہ کروں ۔ میں نے اور پنچوں سے رائے لی ہے سب راضی ہیں اگر یوں نہ مانے گی تو ہم عدالتی کارروائی کر سکتے ، پاگل نہ بن ۔ ہمارا کہنا مان ، تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں ۔ خرچ برچ کے لئے کچھ درکار ہو تو یہ لیتی جا ۔

یہ کہہ کر انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ صندوق سے نکال کر ریوتی کی طرف پھینک دیا ۔ ریوتی نے نوٹ اٹھا کر وہیں پرزے پرزے کر ڈالا ، اور تمتماتے ہوئے منہ سے بولی ۔ برادری نے اس وقت ہماری بات نہ پوچھی ، جب ہم روٹیوں کو محتاج تھے ، میری بدنصیب ماں مر گئی برادری کا کوئی آدمی جھانکنے تک نہ گیا ۔ میرا بھائی بیمار رہا کسی نے خبر تک نہ لی ایسی برادری کی مجھے پرواہ نہیں ۔

ریوتی چلی گئی ۔ تو جھابرمل پاس کی کوٹھری سے نکل آئے ، جہاں وہ پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے ۔ چہرے پر جھاڑو پھری ہوئی تھی ۔

مسز کبیر داس بولیں ، لڑکی کتنی گھمنڈن ہے ۔ آنکھ کا پانی مر گیا ۔

جھابرمل نے نوٹ کے پرزوں کو سمیٹتے ہوئے رونا منہ بنا کر کہا ، پچاس روپوں پر پانی پھر گیا

آیا تھا صبح بے طفلانہ بے کسی روتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، نہ کچھ بولتا نہ کہتا، یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا، پڑا پڑا بے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا، بڑے بڑے جلد میں خراش ہو گیا تھا سر کے بال گر گئے تھے، ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے، چارپائی میں ایسا سمٹا ہوا تھا کہ جیسے ہی نہیں، تصویر مٹ گئی تھی، صرف اس کا عکس باقی تھا، ماں رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی، بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

ایک دن شام کے وقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے سوشیلا تو پہلے ہی سے تقدیر ٹھونک رہی تھی، یہ حالت دیکھی تو چھاتی پیٹنے لگی، اسے بے بسی میں اور کچھ نہ سوجھا، کھڑی ہو گئی اور موہن کی کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہو کر بولی، بھگوان یہی میری اس جنم کی کمائی ہے، اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی، یہ چوٹ نہ سہی جائے گی۔ تم اسے اچھا کر دو، اس کے بدلے مجھے اٹھا لو، بس میں تمہاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں۔

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے، کیا ہم میں سے بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے کوئی رقم اڑائی اسی دن ہمیں اس رقم کا دوگنا نقصان اٹھانا پڑا، اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر، اسی رات کو موہن کا بخار اتر گیا، اور سوشیلا کو بخار آ گیا، بچے کی تیمارداری میں آدھی نیند ہی ہو رہی تھی۔ بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بستر مرگ پر سلا دیا، معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا، اس کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی، تیسرے دن موہن چارپائی سے اٹھا، اور ماں کے پاس آ کر اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگا، طویل بیماری کے بعد ہم میں جو ایک روشن ضمیری آ جاتی ہے اس سے اسے آنے والے سانحہ کا الہام سا ہو گیا تھا۔ ماں نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور بولی کیوں روتے ہو بیٹا، میں اچھی ہو جاؤں گی، جب تم کو بھگوان نے اچھا کر دیا تو میری کیا فکر، وہی بھگوان تمہارے ماتا پتا ہیں۔ وہی تمہاری پرورش کریں گے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔

ریوتی نے دل شکستہ ہو کر کہا اماں کے پاس روپے کہاں ہیں مہینو جی! -
کسرمل جھڑک کر بولے تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر گھسے کو کہتی ہے تیرا ماموں کہاں ہے
اس سے جا کر کہہ سیوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلالے جائے یا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لٹکا کر
لے جاتی یا ابھی وہیں پڑی ہوئی تو سالی ہوئی ہے، کیسی بے سمجھ عورت ہے، گھر میں ٹکا نہیں سو ڈاکٹر کی
واسطے کر دی گئی ہوگی جیسے بچے ہی دے دیں گے، بچے ہی کیوں نہیں دیں، بیماری کی کھال اوڑھ کر
کام کر کے لے جھول یوں اٹھا دے کے لئے نہیں، ہم کے لاکھوں آدمی ہسپتال میں اچھے ہو جاتے ہیں
پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں، ابھی بھاگوت کی کتھا سننے والی ہے کسی ٹرکو کا خرچ ہے اس طرح
ہر ایک کے لیے ڈاکٹر گھسے لگیں تو تو اس کا کوئی کام ہی نہ ہو

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی مگر جو کچھ سنا تھا وہ کہہ کر ماں کے رحم و رنگ نہ
جھڑکنا چاہتی تھی، پیار کر دھا سسٹر جی لئے نہیں کہیں باہر گئے ہیں
سنبھلائے ڈانٹ کر کہا تو ہم ہی سے کیوں نہیں کہا، پہلی کوئی مٹھائی رکھی بھی جو دوڑی ہوئی
ہوئی آگئی

اسی وقت ستلال ایک وید کو لے کر آگئے

(۷)

مگر وید جی ایک دن لگو دوسرے دن رہنے جب پوری عمر کی جگہ آدمی بھی نہ ملے اور
وہ اس علاج سے کسی بوڑھے مریض کے بچنے کی امید ہی سو ہو پھر وہ کس برکت سے رود آمیں سیوا سمتی
کے ڈاکٹر صاحب بھی دلدل بڑی مشکل سے تب پھر انہیں بھی کی رسم سو ہی چھائی کو کار
تب لگا تھا اور ماولی برادری کے ڈی ہیڈ تو ہی تھے ان کے معالجے میں ہر طرح کا فائدہ تھا

ادھر ہوری کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا مگر کلارے
اچھے کا نام لیا، پیر سے پاؤں کی طرح گردن پر السا سودا ہو گیا تھا کہ ہلا تک نہ تھا ہوش کا عجز اتنا
سرد اور افسردہ ہو گیا تھا گو یا مردن کا ایک قطرہ بھی جسم میں نہ ہو اسے دیکھ کر رحم آتا تھا، لمبا لمبا چہرہ نکل

تم اناتھ ہو، جو مزاج تب تھا وہی اب ہے، میرے دھن بھاگ کہ تم میرے گھر میں آؤ، میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی تھیں کہ میں تم سے کرایہ مانگنے جاؤں گی۔

ان پیشنی سے بھرے ہوئے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس نے آج دیکھا سچی انسانیت اور محبت غریبوں اور رذیلوں ہی میں رہتی ہے۔ بڑوں کا دل بھی بڑا ہوتا ہے تکبر اور خود نمائی سے پُر۔

اس بڑھیا کے ساتھ رہتے سوشیلا کو چھ مہینے ہو گئے تھے، اس کی مادرانہ الفت میں سوشیلا کو اپنا رنج و غم بہت کچھ بھول گیا تھا۔ وہ جو کچھ پاتی لا کر سوشیلا کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ دونوں بچے اس کی دو آنکھیں تھے، مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انہیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ بھی سکے۔ بڑھیا آسمان سر پہ اٹھا لیتی۔ سنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لا کر دیا کرتا تھا، اس سے فراغت کے ساتھ گزر ہو جاتی تھی۔ سوشیلا گھر کی مالکن تھی۔

کاتک کا مہینہ تھا، فصلی بخار پھیلا ہوا تھا، موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا اور تین دن تک بے ہوش پڑا رہا، بخار اتنی شدت کا تھا کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ سی لگتی تھی۔ سوشیلا کو ٹائیفائیڈ کا اندیشہ تھا۔ اس کی جان سوکھی جاتی تھی، کیا کرے، کس سے کہے،

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا بیٹی تو نے سیٹھ جی کا گھر دیکھا ہے نہ، جا کر ان سے میرا پرنام کہنا اور کہنا بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے۔ چھن بھر کو بھی نہیں اترتا، کوئی ڈاکٹر بھیج دیجیے۔

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی، دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی، کبیر داس نے حال سنا، اپنے منیم سے بولے ایسا حکم بھیجتی ہے جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں، کھانے کا تو ٹھکانا نہیں، انہیں ڈاکٹر چاہیے، چڑیل۔

ریوتی سے بولے، جا کر کہہ دے، ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہو گی۔ راضی ہو تو بھیج دوں۔

سوشیلا تشویشناک لہجہ میں بولی اچھا میں سوچ کر جواب دوں گی۔ ایک بات مجھے دکھا دیا
سیٹھ جھابرمل جی مسکرا کر بولے "دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی وہ تو تیرے سامنے ہی کھڑا
سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا۔ نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا یہ پچاس سال کا بڈھا
کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس، سینہ کا گوشت لٹک کر ناف تک آ پہنچا ہے، ٹھوڑی سینہ کو بوسہ لے رہی
ہے ارادت کے ستون جیسے کوئی زلزلے میں منہدم ہو گئے ہوں۔ اور اس پر یہ گھمنڈ، یہ حمق
ہے کہیں المیچ میں آ کر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے باندھ دوں گی، میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی
پر اس مرد کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد نہ کروں گی۔ مگر اس نے ضبط کیا، یہ زمانہ کی
خوبی ہے کہ ایسے کمینوں کو اس کی بے کسی کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے، بولی آپ کی اس عنایت
کے لئے آپ کی مشکور ہوں، سیٹھ جی۔ مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کر سکتی۔
جھابرمل تند ہو کر بولے تو اور تو کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کے لئے برادری میں کوئی کنوارا
لڑکا مل جائے گا۔

"تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی۔"

"اور سیٹھ رام ناتھ کے نام کو داغ لگائے گی۔"

"نام کے لئے اپنی ساری جائداد کھوئی۔ زیور کھوئے، مکان کھویا لیکن لڑکی کو کنوئیں
میں نہیں ڈال سکتی، نام رہے یا جائے۔"

"تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دے دے۔"

"ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

جھابرمل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے، اور خانہ داری کی ایک ایک چیز
نکال کر گلی میں پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا۔ مٹکے چور چور ہو گئے، برتن ٹوٹ گئے، صندوق کے کپڑے
بکھر گئے، چیتھڑوں کو جوڑ کر دیوتی نے کھیلنے کے لئے جو خوبصورت سی گڑیا بنا رکھی تھی اس کے اعضا
منتشر ہو گئے، اور اس کے ریزے ہوا میں اڑ گئے، سوشیلا ایک بے حسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی

تب حالی ہی کرنے سے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں مصر جی آپ جائیے اور سامان لاکر
ڈال دیجیے

یہ کہتی ہوئی سوسیلا اندر گئی بچوں کو کھانا کھلایا، ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ نگلی
برتن مانجھے پھر ایک یکہ منگوا کر اس پر مختصر سا سامان لادا اور بادل ناخواستہ اس گھر سے ہمیشہ کے
لئے رخصت ہو گئی جسے اس نے اپنے ارمانوں سے کئی بستیوں کے لئے سجایا تھا، اس وقت دل میں کسی
امنگ کا پاس یا ارمان نہ تھا کہ جو جانا اس کنگر کا کٹری کچہ سیٹھ جی مرحوم نے اس عرصے میں ہزاروں
روپئے خرچ کر کے اپنی نگرانی اور دیکھ بھال سے تیار کرایا تھا جس وہ مکان بنا ہو گا اور
آبادی کی رسم ادا ہوئی اس دن کی ہر اینٹ پر اس کا نقش ہو رہا تھا سوسیلا کو اسی وقت سوچ کر
پڑی کہ وہ ایک مدت تک بنا رہی اس گھر سے اتنے ہی دنوں میں کسی یادیں وابستہ ہو گئی تھیں
اس گھر میں اس کے دو لڑکے رستے بستے اس کے شوہر نے دنیا کو خیرباد کہا اس کے مالوں کی
چیں گویا اس کی دیوار پر سنڈلا رہی ہوں اس کا ایک ایک کونا گویا اس کے دکھ سکھ
اور اس کے سکھ سے سکھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کے
لئے جدا ہو رہا ہے

اس نے رات ایک ہمسایہ کے گھر میں کاٹی اور دوسرے دن دس روپئے ماہوار پر ایک
گلی میں دوسرا مکان لے لیا

(۵)

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس حال میں کاٹے وہ دیکھنے والے ہی
سمجھ سکتے ہیں جو ایک ہوادار پختہ دیکھا اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو
اس کے لئے یہ چار مکان تنگ و تاریک رہنا ہے کم تکلیف دہ نہ تھا مگر خدا ہوتا رہے
سیٹھ اول کا دوست بھولا آتا بھی ان مرحوموں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا اگر سوسیلا شروع
سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی کپڑے سیتی، یا کسی کا کھانا پکا کر گذر کرتی مگر خوش حال

دہی سے روٹی کھانے لگا، عام لڑکوں کی طرح وہ بھی خودغرض تھا، بہن سے پوچھا بھی نہیں
سوشیلا نے تیوریاں چڑھا کر کہا، اکیلا ہی کھا جائے گا۔ بہن کو بھی دے دے۔
موہن شرمندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
ریوتی بولی نہیں اماں۔ کتنا ملا ہے، تم کھالو موہن تمہیں جلد نیند آجاتی ہے، میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی۔

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی، ریوتی نے باہر جا کر پوچھا معلوم ہوا سیٹھ کیرو اس کے آدمی ہیں۔ مکان خالی کرانے آئے ہیں۔ سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔ برآمدے میں آکر بولی۔ ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی سے مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہو گئی، میرا پچاس ہزار کا مکان بیس ہزار میں لے لیا۔ اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کئے، پھر بھی پیٹ نہیں بھرا۔ کہہ دو، میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی۔
منیم نے ملامت سے کہا، بائی جی میں تو نوکر ہوں، میرا کیا اختیار ہے۔ جب ملکیت دوسرے کی ہو گئی تب آپ کو مجبوراً چھوڑنی ہی پڑے گی۔ قانون تو کسی کی حالت نہیں دیکھتا۔
سوشیلا سمجھ گئی منیم جا کہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گذارہ ہوگا۔ نرم ہو کر بولی۔ اتنا میں جانتی ہوں منیم جی، تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا۔ دس دن کی مہلت اور دیدیں۔ لیکن نہیں کچھ عرض معروض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں دس یا پانچ دن کے لئے کسی کا احسان لوں، میری تقدیر میں اس گھر میں رہنا لکھا ہوتا تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا۔
منیم نے پوچھا تو کل سویرے تک خالی ہو جائے گا۔
سوشیلا بولی۔ ہاں ہاں کہتی تو ہوں اور سویرے تک کیوں؟ میں ابھی خالی کئے دیتی ہوں۔ میرے پاس ایسا اثاثہ ہی کیا ہے۔ تمہارے سیٹھ جی کے رات بھر کے کرائے کا کیوں نقصان ہو جا کر قفل لاؤ۔ یا لائے ہو۔
”ایسی کیا جلدی ہے بائی جی، کل اطمینان سے خالی کر دیجئے گا۔

(۴)

ایک مہینہ گذر گیا۔ سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی۔ اور بھاری بیس روپیہ کل ہی گئے
اس عرصہ تھوڑے سے رزق پر رہے تھے۔ اگر مرمت سے چھوٹے چھوٹے بل بکالے تھے۔ کچھ روپے
ڈاکٹر کو دے تھے کچھ میں کر ڈھیر ردی کو سوشیلا کو یہ ریس گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر نکالنا پڑا
اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ سیلا وہ سب مال ایک دکان میں چھوڑ دیا۔ کبھی
کبھی دو چار روپے پیدا ہوا، اور صبح کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ بچے تو صورت حال کو سمجھتے تھے، دل کو
دل کڑا کرتے تھے لیکن مکان کے سامنے سے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں ہی دوسرے کون
کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو ان کے منہ میں پانی بھر آتا۔ آنکھوں میں حسرت جھانکنے لگتا
ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے کہ رحم آتا تھا۔ وہی بچے جو چند روز پہلے سموسے اور مٹھائیوں
کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے۔ وہی حسرت جن سے لاری
کی دھوپ کروالی تھی ان مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے پر کوئی جھانکتا تک نہ تھا

شام ہو گئی تھی۔ سوشیلا چولہا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی اور دونوں بچے چولہے کے
پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں کے بچے کا اصل نام لڑکی گیارہ
سال کی تھی۔ لڑکا آٹھ سال کا

موہن مضطر ہو کر بولا۔ اماں مجھے روکھی روٹیاں ہی دے دو بڑی بھوک لگی ہے
سوشیلا نے محبت آمیز لہجے سے کہا ذرا اور صبر کرو بیٹا ابھی دال پکی جاتی ہے
ریوتی کو بھائی پر رحم آگیا بولی میرے پاس ایک پیسہ ہے میں ابھی لیے آتی ہوں
سوشیلا نے پوچھا تو نے پیسہ کہاں پایا
ریوتی نے معصومانہ انداز سے کہا مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری میں ملا تھا
سوشیلا مطمئن ہو کر بولی۔ اچھا جا مگر جلد آئیو
ریوتی دوڑتی ہوئی باہر گئی اور ایک پیسے کی ریوڑیاں لے آئی، ماں نے روٹی دے دی، موہن

اس کی بکنی کی طرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں۔

برادری میں رقعہ پھرا، ادھر تین چار دن بچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کئے، گنگی دھنی رام جی کی آڑھت سے آیا، میدے اور چینی کی آڑھت بھی انہیں کی تھی، پانچویں دن صبح کے وقت برہمنوں کا کھانا ہوا، شام کو برادری کی روٹی ہوئی، سوشیلا کے دروازہ پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں، صحن، بیٹھک، دالان، برآمدہ، اوپر کی چھت سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے لوگ کھانا کھاتے تھے اور بچوں کی تعریف کرتے تھے، سچ تو سب ہی کرتے ہیں اگر انتظام کا سلیقہ چاہیئے، ایسی مزیدار چیزیں کم کھانے میں آئی ہیں لوگ تعریفیں کر رہے تھے۔

سیٹھ چمپارام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی ہے۔

"امرتیاں کیسی خستہ ہیں"

"رس گلے میووں سے بھرے ہیں"

"سارا انتظام بچوں کا ہے"

دھنی رام نے انکساری سے کہا، رام ناتھ سے میرا بھائی چارہ تھا۔ ہم نہ کرتے تو کون کرتا، یہ سمجھ لو کہ چار دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔

"آفریں، دوست ہوں تو ایسے ہوں"

"کیا بات ہے، آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا، برادری یہی کھانا کھلانا دیکھتی ہے رقم دیکھنے نہیں آتی"

مہمان لوگ تعریفیں کر کر کے تر مال اڑا رہے تھے، اور ادھر کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی، دنیا میں ایسے خودغرض لوگ بھی ہیں، ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے، سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کھانا کھا رہے ہیں۔ کوئی اتنا بھی نہیں پوچھتا کہ غریب یتیموں کے لئے بھی کچھ بچا یا نہیں۔

دھنی رام پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی اور یہ بھی تو بیس ہزار ہی تو کرا دو
سوکھے لال میں کیا میں چالیس کرا دوں کوئی گاہک بولے آپ لوگ کہتے ہیں تو میں بیس ہزار
کی بات چیت کر دوں گا
دھنی رام چالیس ہزار میں ہی دیا ہے تو کبیر داس ہی کہوں یہ لیس بات سمجھا لو دوسروں
کو کیوں ملا جائے
کبیر داس آپ سب لوگوں کی مہربانی ہوئی میں تو یہی چاہتا ہوں کہ مائی کے ساتھ جہاں تک
ہو سکے رعایت کی جائے

دھنی رام جی نے ہاں ہاں کہہ کر منظوری دے دی اور پچاس میں بات طے کر دی گئی
یہ سودا ابھی پکا ہو گیا اسی دن وکیل سے معاہدہ لکھا گیا جھٹ رجسٹری ہو گئی سوشیلا کے
سامنے معاہدہ لایا گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں
سے اس پر دستخط کر دیے اس کے سوا اس کو کوئی چارہ نہ تھا بے زبان مویشی کی طرح یہ گھر
بھی سکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ دے کر دکھ میں ساتھ چھوڑ رہا ہے
پنچ لوگ سوشیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کو رقعے لکھ رہے ہیں ادھر دالان میں سوشیلا بیٹھی
اپنی قسمت کو رو رہی ہے، ادھر رقعہ تیار ہوا ادھر بے کس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو
ٹپک کر رقعے پر گر پڑے

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا، مائی کی چھینٹ کہاں سے آئی
ست لال بالا کشمی رودھن کا ہن نے رقعے پر اپنے خون کے آنسوؤں کی مہر لگا دی
ہے۔
دھنی رام سدا لوگی آواز میں ارے تو کیوں رو رہی ہے مائی یہ رونے کا وقت نہیں تجھے تو
خوش ہو جانا چاہئے کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آ کر ایک نیک کام کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس
جائداد کے ساتھ تو اتنے دنوں عیش اور آرام سے رہی اس کی آتما کے لئے کچھ دان دیا جائے گی

میں تکرار بھی ہو گئی، لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانی پڑی، انصاف دربل کی طرف تھا۔
دھنی رام نے ذرا چٹکی لی، دیکھو دربل داس مال تو لے جاتے ہو، مگر ساڑھے تین ہزار کو
زائد کا ہے، میں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔
کبیر داس بولے، ابجی تو گھر میں ہی تو ہے، کہیں باہر تو نہیں گیا، ایک دن دوستوں کی
دعوت ہو جائیگی، اس پر چاروں اصحاب ہنس پڑے، اس کام سے فرصت پاکر اب مکان کا سوال اٹھا
کبیر چند تیس ہزار دینے پر تیار تھے، لیکن قانونی کا ۔ روائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا، یہ خامی کیوں
رکھی جائے، فوراً ایک دلال بلایا گیا، پستہ قد آدمی تھا، پوپلا منہ کوئی ستر سال کی عمر، نام
تھا جو کھے لال۔
کبیر داس نے کہا، جو کھے لال سے ہماری تیس سال کی دوستی ہے، آدمی کیا
ہیرا ہے۔
بھیم چند۔ دیکھو جو کھے لال یہ مکان بکتا ہے، اس کے لئے کوئی اچھا خریدار لاؤ، تمہاری
دلالی پکی۔
کبیر داس۔ بازار کا حال اچھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ
کے بچوں کو خسارہ نہ رہے (جو کھے لال کے کان میں) تیس سے آگے نہ جانا۔
بھیم چند۔ دیکھئے کبیر داس یہ اچھی بات نہیں ہے۔
کبیر داس۔ تو میں کیا کر رہا ہوں۔ میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اچھے دام لگانا۔
جو کھے لال۔ آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں، رام ناتھ
میرے بھی دوست تھے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں ایک لاکھ سے
ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئی لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے اس وقت
اس کے پچیس ۲۵ ہزار سے زائد نہیں مل سکتے، بھینٹ سے کوئی گاہک مل جائے تو دس پانچ ہزار
اور مل جائیں گے، لیکن اس وقت تو پچیس ہزار بھی بہت ہیں۔

پڑ کر اپنا نقصان کیوں کریں۔ بھیم چند نے بہت اچھا کیا انہیں ہوشیار کر دیا لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی، پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔

سوشیلا نے دربل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا، ان کی طرف بے کسانہ نظروں سے دیکھ کر بولی، میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ آپ لوگ مالک ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

دربل داس نے پوچھا تیرے پاس کچھ تھوڑے بہت زیور تو ہوں گے ہی۔

سوشیلا نے قبول کیا، ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہیں نا گے ابھاری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں، یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دیئے۔

دھنجی رام بولے، مگر یہ تو مشکل سے تین ہزار میں اٹھیں گے۔

دربل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا، تین ہزار کیسے میں ساڑھے تین ہزار دلا دونگا

بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا، میری بولی چار ہزار کی ہے۔

کبیر چند کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا پھر موقع ملا، بولے چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے، برادری کا کھانا ہے، یا کوئی بلا ٹالنا ہے، کم سے کم دس ہزار کا خرچ ہے، مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔

سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا، میں کہتا ہوں آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں۔ آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا، کیا انہیں بھکاری بنا کر چھوڑو گے۔

لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا، بلا مکان فروخت کئے کسی طرح کام نہیں چل سکتا، بازار آجکل مندا ہے، تیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے، تیئیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں، پانچ ہزار بچیں گے، اس طرح نو ہزار میں بڑی کفایت سے برہم بھوج بھی ہو جائیگا اور برادری کی دعوت بھی ہو جائے گی، پنچوں کو آخر مرحوم کے بال بچوں کا خیال بھی تو کرنا ہے۔

سوشیلا نے دونوں بچوں کو سامنے کر کے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ پنچو میرے بچوں کا منہ دیکھو!

سوسیلا نے خوفزدہ ہو کر کہا مہاجنوں کا حال نہ کہئے مہاشہ جی! ان کی تو یہ عادت ہے
میں نے تو آپ کی بات نہیں ٹالی، آپ میرے بزرگ ہیں، گھر کا حال آپ کو معلوم ہی ہے اس لیے
مالک کی روح کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی، لیکن جب ان کے مال بیچ کر کھاؤں گی تو ان کا نام
نکل جائے گا، بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہوگا لڑکے کو لکھانا پڑھانا پڑے گا ہی، برہمنوں کو کھلا دیجئے
لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے

دونوں اصحاب کو گویا تیر لگ گیا بھلا ایسی بات بھی زبان سے نکالی جاتی ہے ہم لوگ
ایسے بے رسا ہی رہ گئے ہیں، دنیا سو طعنے پہنچے گی ہنسی ہوگی بچوں کی بے
ہنسائی وہ کیسے سہ سکتے ہیں اپنے گھر کے دروازہ پر بھاگنا بھی گناہ ہے

سوسیلا رو کر بولی میں عورت ہوں ناداں ہوں مجھ پر غصہ نہ کیجئے آپ لوگ ہی مجھے
چھوڑ دیں گے تو میرا کیا ٹھکانا ہوگا

اتنے میں دو اصحاب اور آگئے، ایک بہت موٹے دوسرے بہت دبلے، نام بھی بسم ناتھ
بھیم چند اور مول داس، دھمی رام نے مختصر لفظوں میں ساری کیفیت انہیں سنا دی اور مول داس
نے بہت ہمدردی سے کہا تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپیہ دے دیں اس کا لڑکا
سیانا ہو جائے گا تو روپے مل ہی جائیں گے، اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست کے لئے کچھ بل کھا جانا
کوئی بڑی بات نہیں۔

سسیلا نے خوش ہو کر کہا اس مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا

پھر چند سو کی تجویز کر کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، مول داس جی اس وقت
بازار میں کسی کے پاس پچاس روپے رکھے ہوئے ہیں تم دیدیئے گا، رام کا نام کہاں دیکھے
بھیم چند یہ تو ٹھیک ہے بالا سا ہی دیا اور کبھی دکھلائی نہیں گریں اور لڑکی بیاہنے
اکثر چند آگئے وہ سوسیلا کے مکان پر آنے لگے جیسے کہ ایسی باتوں سے شکار
ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا، وہ اپنے روپے وصول کر کے چھوڑیں گے ہندوؤں کے محلے میں

سیٹھ جی! ۔۔ پانچ ہزار بھی نہیں۔

سوشیلا ۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی۔

دھنی رام نے کبیر چند کی طرف دیکھ کر کہا ۔ تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا۔

کبیر چند ۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ، ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے ، رام ناتھ کا کتنا نام تھا برادری کے ستون تھے یہی اس وقت ایک علاج ہے ، بیس ہزار میرے نکلتے ہیں ، سود بٹہ لگا کر کوئی پچیس ہزار ہوں گے ، باقی روٹی میں خرچ ہو جائیں گے ، اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آجائے گا۔

دھنی رام ۔ آپ کے پاس یہ گھر کتنے پر رہن تھا۔

کبیر ۔ بیس ہزار روپیہ سینکڑہ سود۔

دھنی رام ۔ میں نے تو کم سنا ہے ۔

کبیر ۔ اس کا تو رہن نامہ رکھا ہے ، زبانی بات چیت تھوڑی ہے ، میں دو چار ہزار کے لئے جھوٹ نہ بولوں گا۔

دھنی ۔ نہیں نہیں ، یہ میں کب کہتا ہوں ، تو تو نے سن لیا بائی ، پنچوں کی صلاح ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اسی وقت آ پہنچا یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے ، وہ بول اٹھا کس لئے مکان بیچ دیا جائے ، برادری کی روٹی کے لئے ، برادری تو کھا پی کر راستہ لے گی ۔ ان یتیموں کی کون پرورش کرے گا ، یہ بھی تو سوچنا چاہیئے۔

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا ۔ آپ کو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں ، صرف آئندہ کا فکر کرنے سے کام نہیں چلے گا ، مرحوم کا کریا بھی کسی طرح سدھانا ہی پڑے گا ہنسی تو ہماری ہوگی ۔ دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں ، وقار کے لئے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں ، جب وقار ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا ، اگر ہماری صلاح پوچھو گے تو ہم تو یہی کہیں گے آگے بائی کو اختیار ہے ، جیسا چاہے کرے ، ہم ہم سے سروکار نہ ہوگا ، چلئے کبیر چند جی چلیں۔

باہر دیکھنے، سوشیلا کا دل بھی ایک لمحہ کے لیے پارہ پارہ ہو گیا۔ سیٹھ دھنی رام برادری کے چودھری ہیں لیکن بہو کا دل سیٹھ جی کی اس دلجوئی سے خوش ہو گیا اور وہ ... بیٹھ گئی یہ لوگ

نیک بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر لیں تو اور کون لے، آخر یہ ہے ایسے ہی مددوں پر مصیبت

کے وقت سکھوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ سوشیلا گھونگھٹ نکال کر برآمدے میں آکر کھڑی ہو گئی دیکھا

تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی پہلے آدمی کھڑے ہیں

دھنی رام جی بولے بہو جی بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو جو دکھ پہنچا ہے

وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے اتنی جان کی طرح کیا تھی، لیکن پرماتما کی مرضی یہی تو ہمارا یہی دھرم ہے

کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کے لئے کوئی راستہ نکالیں، کام ایسا کرنا چاہیے کہ گھر کی

عزت بنی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی روح کو تسکین ہو

کیسر داس نے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا ہر سکے سوا دیا میں باور

ہے کیا اس کو سمجھانا اس کی حماقت ہمارا دھرم ہے، لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے کتنے

روپے تمہارے پاس ہیں بہو؟

سوشیلا گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی جو تھوڑے بہت تھے بیماری میں اٹھ گئے

دھنی رام یہ تو بڑی الجھن پیدا ہو گئی، ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے

کیسر چند۔ جو کچھ بھی دعوت تو دینی ہی ہوگی ہاں اپنی بساط دیکھ کر کام کرنا چاہیے ہیں تو میں لیے

کی صلاح نہ دوں گا، گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہو سکے اس میں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے مرنے

والے کے ساتھ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے، اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا اس سے ہمیشہ کے

لیے رشتہ ٹوٹ رہا ہے اس لیے سب کچھ حسب کے مطابق ہونا چاہیے، برہمنوں کو پوری اور

مٹھائیاں دی جائیں گی، لیکن برادری کی دعوت اس اصول سے کرنی چاہیے کہ عزت میں

فرق نہ آئے

دھنی رام تو کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے، یہ تو ایک بڑی مشکل بات کہہ دی

زادِ راہ

سیٹھ رام ناتھ نے بستر پر پڑے ہوئے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سشیلا کی
طرف دیکھ کر کہا میں بدنصیب ہوں سشیلا، میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ تکلیف اٹھانی پڑی
جب گھر میں کچھ نہ تھا تو رات دن روزگار کے جھگڑوں اور بچوں کے لیے مرتی رہتی تھیں جب
معاملہ ذرا کچھ سنبھلا اور تمہارے آرام کرنے کے دن آئے تو تمہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں، آج تک مجھے
زندگی کی امید تھی، مگر آج وہ امید جاتی رہی، دیکھو سشیلا روؤ مت دنیا میں سبھی مرتے ہیں کوئی
دو سال آگے، کوئی دو سال پیچھے، اب عیالداری کا بوجھ تمہارے سر ہے، میں نے نقد روپیہ
نہیں چھوڑا، لیکن جو کچھ ہے تمہاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائے گی، یہ سوہن
کیوں رو رہا ہے؟

سشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا، ضدی ہو گیا ہے اور کیا آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے
ہے کہ موٹر لوں گا پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر

سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہو گئی تھی، بولے تو منگا دو نا ایک، بیچارہ
کب سے رو رہا ہے کیا ارمان دل میں رہ جائے، ہم سب کا نکل گئے، رانی کے لیے ولایتی گڑیا بھی منگا دو
دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے جس دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا، جو کار
ڈاکٹروں نے کمائی، بچے مجھے کیا یاد کریں گے کہ کوئی باپ تھا، باپ تو وہ ہے جو بچوں
لڑکوں سے پیار سمجھا، ایک پیسے کی چیز لا کر بھی نہیں دی افسوس
آخری وقت جب دنیا کی ناپائیداری حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے

میں نے پوچھا، آپ کا نام کیا ہے، کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا
اس نے لالٹین اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور بولا، میرا نام جیکسن ہے لوگ جیکسن، مرحوما
اسٹیشن کے پاس جس سے میرا نام پوچھو گے، میرا پتہ بتلا دے گا
یہ کہہ کر وہ پیچھے کی طرف مڑا، مگر یکایک لوٹ پڑا اور بولا مگر تمہیں یہاں ساری رات
ٹھہرنا پڑے گا، اور تمہاری اماں گھبرا رہی ہوں گی، تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، میں تمہیں اس پار پہنچا
دوں، آج کل پانی بہت کم ہے، میں تو اکثر تیر آتا ہوں۔
میں نے احسان سے دب کر کہا آپ نے یہی کیا کم عنایت کی ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا ورنہ
شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا، میں یہاں ٹھہرا رہوں گا، اور صبح کو کشتی سے پار چلا جاؤں گا
"ہاں اور تمہاری اماں روتی ہوں گی کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گذری"
یہ کہہ کر مسٹر جیکسن نے مجھے جھٹ اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور اس طرح لے کر چلے
گویا سوکھی زمین ہے، میں دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن پکڑے ہوئے ہوں، اور کچھ
بس بھی نہ تھا پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے اور ٹانگوں میں سنسنی سی ہو رہی ہے، مگر جیکسن صاحب
اطمینان سے چلے جا رہے ہیں پانی گھٹنے تک آیا، پھر کمر تک پہنچا، اوہ، سینہ تک پہنچ گیا سانس کو
ایک ایک دم مشکل ہو رہا ہے میری جان نکلی جا رہی ہے لہریں ان کے گلے لپٹ رہی ہیں میرے
پاؤں بھی چھو گئیں، میرا جی چاہتا ہے ان سے کہوں، خدا را واپس چلئے مگر زبان نہیں کھلتی ہوا
نے جیسے اس حادثہ کا معائنہ کرنے کے لئے سب دروازے بند کر لئے ہیں شاید کہیں جیکسن صاحب
پھسلے تو میرا کام تمام ہے، یہ تو تیر کر بھی نکل جائیں گے میں لہروں کی خوراک بن جاؤں گا بار بار
کہتا ہے میں نے پہلے کیوں نہ تیرنا سیکھ لیا، یکایک جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے
اوپر اٹھا لیا ہم بیچ دھار میں پہنچ گئے تھے بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک ایک قدم آگے رکھنے
میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا، دل کو اس ندی میں بلا کا بہاؤ تھا، لیکن دل کو اطمینان ہو چلا
میں وہ تنگ نالہ جیسی معلوم ہوتی تھی، دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہا

جانتے ہو گے، ہم میں بہت زیادہ ایسے لوگ ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیئے، میں بھی ایک بوتل شراب روزانہ پی جاتا تھا۔ باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے، اگر کفایت سے رہنا جانتا تو زندگی بھر آرام سے پڑا رہتا، مگر شراب نے ستیاناس کر دیا، ان دنوں میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا، کالر ٹائی لگائے چھیلا بنا ہوا، نوجوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا، گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا، شراب پینا، کلب میں تاش کھیلنا اور عورتوں سے دل بہلانا یہی زندگی کا مشغلہ تھا، تین چار سال میں میں نے پچیس تیس ہزار روپے اڑا دیئے، کوڑی کفن کو نہ رکھی، جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی، فوج میں بھرتی ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا، یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں، بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے۔

یورپ سے آکر ایک دن میں شکار کھیلنے لگا ادھر آگیا، دیکھا کہ کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اُداس کھڑے ہیں، میں نے پوچھا کیا بات ہے، تم لوگ کیوں اس طرح اداس کھڑے ہو ایک آدمی نے کہا۔ کیا کریں صاحب زندگی سے تنگ ہیں، نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، سارے جانور آکر کھیت چر جاتے ہیں، کس کے گھر سے لگان چکائیں، کیا مہاجن کو دیں کیا عملوں کو دیں۔ اور کیا خود کھائیں، کل انہیں کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا آج انہیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، جانوروں نے صفایا کر دیا۔

معلوم نہیں اس وقت میرے دل پر کس دیوتا یا نبی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آگیا، میں نے کہا۔ آج سے میں تمہارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا۔ کیا مجال کہ کوئی جانور پھٹک سکے ایک دانہ چر جائے تو جرمانہ دوں۔ بس اس دن سے آج تک میرا یہی کام ہے آج دس سال ہو گئے ہیں میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا، اپنا گذر بھی ہوتا ہے اور احسان مفت ملتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کام سے دل کو خوشی ہوتی ہے ندی آگئی، میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے، جہاں شام کو کشتی پر بیٹھا تھا، اس چاندنی میں ندی مرصع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو۔

علاوہ بھی مجھے تو چین اور کشمیر یہاں بھی ویسے ہی حلیے، ویسے ہی لباس اور ویسے ہی خوش
مزاج اور ویسے ہی سنجیدہ معلوم ہوتے جیسے فرانس یا انگلستان کے، ہماری ان سے خوب بے تکلفی
ہو گئی تھی، ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ بیٹھتے تھے، خیال بھی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے اپنے
نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، کس لئے؟ اسی لئے کہ
بڑے بڑے انگریز سوداگروں کو خطرہ تھا کہ کہیں جرمنی ان کا روزگار نہ چھین لے۔
سوداگروں کا راج ہے، ہماری قومیں انہی کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں
ہیں، جان ہم غریبوں کی گئی، جیبیں گرم ہوئیں موٹے موٹے سوداگروں کی، اس وقت ہماری
ایسی خاطر ہوتی تھی، ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں، ہمارے
اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی، ہمیں گارڈن پارٹیاں دی جاتی تھیں، ہماری جانبازیوں
کی داستانیں مزے لے لے کر اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں، نازک بدن لیڈیاں اور
شہزادیاں ہمارے لئے کپڑے سیتی تھیں، طرح طرح کے مربے اور اچار بنا کر بھیجتی تھیں،
لیکن جب صلح ہو گئی تو انہیں جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا، کتنوں ہی کے انگ بھنگ
ہو گئے تھے، کوئی لولا ہو گیا تھا، کوئی لنگڑا، کوئی اندھا، انہیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی
کوئی نہ تھا، میں نے کتنوں ہی کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھا، تب سے مجھے اس پیشے سے نفرت
ہو گئی، میں نے یہاں آکر یہ کام اپنے ذمے لیا اور خوش ہوں، سپہ گری کا یہی نشانہ ہے کہ
اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو، نہ کہ کروڑ پتیوں کی بے شمار دولت میں
اضافہ ہو۔ یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں لیکن اس
کام میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہ ہوگا، کیونکہ مجھے یہ تسکین ہوگی کہ میری زندگی غریبوں
کے کام آئی، اور یہ بیچارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں، اگر میں بیمار
پڑ جاؤں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ میں اُن کے جسم کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا
تو سب بے تامل اپنا خون دے دیں گے، پہلے میں بہت شراب پیتا تھا، میری برادری کو تو تم

عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آ کھڑا ہوا، میں نے بھی فیاضی سے اس کا قصور معاف کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا، ایک لمحہ میں وہ شخص صندوق کندھے پر رکھے آ گیا، اور بولا چلو، مگر اب ایسی نادانی نہ کرنا، خیریت ہوئی کہ میں تمہیں مل گیا، ندی پر پہنچ جاتے تو ضرور کسی جانور سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔

میں نے پوچھا۔ آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کا لہجہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔
اس نے ہنس کر کہا۔ ہاں میرا باپ انگریز تھا، فوجی افسر، میری عمر یہیں گذری ہے، میری ماں اس کا کھانا پکاتی تھی۔ میں بھی فوج میں رہ چکا ہوں، یورپ کی لڑائی میں گیا تھا، اب پنشن پاتا ہوں۔ لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد تک خون کرنا پڑا ان سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہو گئی، اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا، میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا، میں یہیں رہتا ہوں اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ یہ گنگا کی گھاٹی ہے، چاروں طرف پہاڑیاں ہیں، جنگلی جانور بہت لگتے ہیں، سور، نیل گائے، ہرن ساری کھیتی برباد کر دیتے ہیں۔ میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا، کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلہ مل جاتا ہے، وہ میرے گذر بسر کے لئے کافی ہوتا ہے میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے، جس طرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو، میں تمہیں کسرت کرنا سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤ گے، میں نے پوچھا۔ آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں۔
وہ بولا، ہاں دو گھنٹے روزانہ کسرت کرتا ہوں۔ مگدر اور لیزم کا مجھے بہت شوق ہے، میرا پچاسواں سال ہے مگر ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں، کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں رہوں کیسے، میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں، اپنی رجمنٹ میں میں خوب مضبوط آدمی تھا، مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے، کتنے ہی بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوئے، میرا انہوں نے کیا نقصان کیا تھا، میری ان سے کون سی

تھا ایک موٹا موٹی اونی کوٹ پہنے ہوئے، نیچے نکر، پاؤں میں فل بوٹ، ٹراؤزر کی بکلیں ری
سی مونچھیں، گورا رنگ، مردانہ وجاہت کا مجسمہ

بولا تم تو کوئی اسکولی لڑکے معلوم ہوتے ہو۔

"لڑکا تو نہیں ہوں، لڑکوں کا مدرس ہوں، گھر جا رہا ہوں، آج سے تین دن کی تعطیل ہے"

"تو ریل سے کیوں نہیں گئے؟"

"ریل چھوٹ گئی اور دوسری ایک کے چھوٹتی ہے"

"تو ابھی تمہیں مل جائے گی، بارہ کا عمل ہے چلو میں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں"

"کون سے اسٹیشن کا"

"سنگوت پور کا"

"سنگوت پور ہی سے تو میں چلا ہوں، وہ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہوگا"

"بالکل نہیں، تم سنگوت پور اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو، چلو میں تمہیں
اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں، ابھی گاڑی مل جائے گی، لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں
لیٹ رہو کل چلے جانا"

اب اور مجھے آیا کہ سر پیٹ لوں یا ہنسوں کہ کولہو کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں اور
ابھی سنگوت پور سے کل ایک میل آیا ہوں راستہ بھول گیا یہ واقعہ مجھے یاد رہے گا، اکیلا مجھ
گھٹ اس واسطے کہ ایک میل، گھر پہنچنے کی دھن جیسے اور بھی دہک اٹھی

بولا نہیں، کل تو جمعہ ہے، مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیے

"مگر راستہ پہاڑی ہے، ہاں اگر کوئی جانور مل جائے، اچھا چلو میں تمہیں پہنچائے
دیتا ہوں، مگر تمہارے ری ملنی کی، خطرناک رستے میں رات کو سفر چلنا خطرناک ہے، اچھا پیچھ
میں تمہیں پہنچائے دیتا ہوں، ذرا یہیں کھڑے رہو، میں ابھی آتا ہوں"

کتا دم ہلانے لگا اور مجھ سے دوستی کرنے کا خواہشمند معلوم ہوا اور چلتا ہوا سر جھکائے

پہنچنے کی امید نہ تھی، رات یوں ہی بھٹکتے ہوئے گذر گئی، پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں، معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی، دفعتہً ایک کھیت میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی، گویا شمع امید ہوئی ضرور وہاں کوئی آدمی ہوگا۔ شاید رات کاٹنے کو ٹھکانہ مل جائے، قدم تیز کئے اور قریب پہنچا کہ یکایک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا، اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اٹھا ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آگیا اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا، میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچے کے سوا اور کیا تھا، نہ کوئی لکڑی، نہ خنجر، کیسے بھگاؤں، کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے تو کیا کروں، تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا، میں جتنا ہی دہشت کرتا تھا اتنا ہی وہ اور گرجتا تھا، میں خاموش کھڑا ہو گیا، اور بقچہ زمین پر رکھ کر پاؤں سے جوتے نکال لئے اپنی حفاظت کے لئے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو، اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا، کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اس کے سر پر اپنے زور سے نعل دار جوتا ماروں کہ یاد ہی تو کرے۔ لیکن شاید اس نے میری نیت تاڑ لی اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آگیا اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور اسی وقت میں نے ہیبت زدہ آواز میں پکارا، ارے کھیت میں کوئی ہے، دیکھو یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔ او بھئی دیکھو، تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔

جواب ملا۔ کون ہے؟

"میں ہوں راہ گیر، تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔"

"نہیں کاٹے گا نہیں، ڈرو مت کہاں جانا ہے؟"

"محمود نگر"

"محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے آگے تو ندی ہے۔"

میرا کلیجہ بیٹھ گیا، رونا سا ہو کر بولا، محمود نگر کا راستہ کتنی دور چھوٹ گیا ہوگا؟"

"یہی کوئی تین میل۔

اور ایک قد آور انسان ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، سر پر بیٹ

گھماتے میں، اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا، معلوم نہیں کتنا راستہ طے ہوا، کتنا باقی ہے، اس
کون آدمی نہ آدم زاد، کس سے پوچھوں، اپنی حالت پر روتا ہوا چلا جا رہا تھا، ایک نیا گاؤں
نظر آیا، بڑی خوشی ہوئی، کوئی نہ کوئی دکان یہاں مل ہی جائے گی، کچھ کھالوں گا اور کسی کے
سامان میں پڑ رہوں گا صبح دیکھی جائے گی

مگر وہاں تو دن میں لوگ سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں، ایک آدمی کنوئیں پر پانی
بھر رہا تھا، اس سے پوچھا تو اس نے کہا سب ہی پاس، پھر جواب دیا، اب یہاں گھر سے لگا
تنے تک مل رکھتے ہیں، حلوائی کی دکان ایک ہی ہے، کوئی شہر تھوڑا ہی ہے، اس وقت
تک دکان کھولے کون بیٹھا رہے۔

میں نے اس سے نہایت منت آمیز لہجہ میں کہا کہیں سونے کو جگہ مل جائے گی؟

اس نے پوچھا کون ہو تم

"مدرس ہوں، گھر جا رہا ہوں"

"تمہاری جان پہچان کا یہاں کوئی ہے؟"

"جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے کیوں سوال کرتا"

"تو ہم کسی انجان آدمی کو ہم یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے، اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا
تھا، رات کو ایک گھر میں نقب پڑ گئی، صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا"

"تو کیا تم سمجھتے ہو میں چور ہوں"

"کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا، اندر کا حال کون جانے"

"نہیں ٹھہرانا چاہتے نہ سہی، مگر یہ تو بتا دو میں جانتا کہ یہ اتنا موڑ گاؤں سے تو
ادھر آ گیا ہوں؟"

میں نے راہ دھوکا مائدہ کی ہی مل گیا سڑک پر آکر پھر آگے چلا، اس وقت یہ سوچ رہا تھا
کہاں تھے کچھ خبر نہیں کس راستے سے گاؤں میں آیا تھا، اور کدھر جا رہا تھا، مطلب مجھے لگا کر

چنانچہ اس وقت گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا، مگر صبر کر کے آگے بڑھتا۔

جوں جوں رات گذرتی تھی، جسم تکان سے چور ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ پاؤں میں لغزش ہونے لگی، کبھی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی، جب کبھی لیک میں پاؤں چلا جاتا تو معلوم ہوتا کسی گہرے گڈھے میں گر پڑا ہوں۔ بار بار جی میں آتا، یہیں سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں، کتابوں کا مختصر سا بنڈل من بھر کا لگتا تھا، اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لے کر کیوں چلا، دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا، مگر چھٹیوں میں ایک دن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے گی، خواہ یہ بستارہ اٹھائے چلا آتا ہوں، ایسا جی جھنجلاتا تھا کہ اس بار زحمانت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا، ایک بار میں گر پڑا، اور سنبھل کر اٹھا تو پاؤں تھرتھرا رہے تھے، اب بغیر کچھ کھائے ایک قدم اٹھانا دشوار تھا، مگر یہاں کیا کھاؤں، بار بار رونے کو جی چاہتا تھا، اتفاق سے ایک ایکھ کا کھیت نظر آیا، اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ ایکھ توڑ لوں اور مزے سے، چوستا ہوا چلوں، راستہ بھی کٹ جائے گا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائے گا، مگر مینڈ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں الجھ گیا، کسان نے شاید مینڈ پر کانٹے بکھیر دیئے تھے، شاید بیر کی جھاڑی تھی، دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی، کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ گئی، بھوک تو غائب ہو گئی، فکر ہوئی اس نئی مصیبت سے کیونکر نجات ہو، کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسری جگہ چمٹ جاتے، جھکتا تو جسم میں چبھنے، کسی کو پکاروں تو چوری کھل جاتی ہے، عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا، اس وقت مجھے اپنی حالت پر رونا آ گیا، کوئی صحرا نورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہوگا، بڑی مشکل سے آدھ گھنٹہ میں گلا چھوٹا، مگر دھوتی اور کرتے کے ماتھے گئی، ہاتھ اور پاؤں چھلنی ہو گئے وہ

وہ مکان سے باہر رہے مگر وہ شہر کی طرف بار بار گرسہ اور سے معرکہ نگاہوں سے دیکھا اور
ٹکر وہاں کسی بازتقل کو کھٹکھٹانا تھا جھٹکے دیے مگر ظالم حامی ہمسائی کی بارش نگاہ
کا مارہ لیا اس میں جھانک کر دیکھا ایک لکڑی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش
کی مگر اس کی سیل بلستر کھوئی ہوئی سی ہر سی رہ کھانے پینے میں کچھ مزہ ہے اور کھیلنے کو دے
میں عشق یا مارپیٹ کے رستے دل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا اور مگر اور کس طرح کی تعاے
میں ایسے پھینک تو دیا ہیں کہ آنا ہی تو ہوں کہ آج کھایا اور کیا ایک بار نکالا اس میں
کا موتی ہو یا اماں جان سے مطلب کی ہے مشک لیکن اسمیں مجھے ایک عاد کا ہے ا سکھنے کا
کام ہو اگر وہ آج کبھی کھیلنے مت جا مار معصوں جب پڑھو یا طلب میں بیٹ سمجھ آ
خود اس کے لئے کہا مت لگاؤ ملماں سب کم زور تو کیا میں بانے لگتا ہوں تو میرے بھی کو متوں
میں سہا نہیں تو پھر اس ملک سا سا ل میں کھیل اماں کی جماعت تو پتی تھ رہوں اور دو اشتوں کو تو
کر دوں ہم چکے دل میں سے تیغ بالی ایمیں سے علی الصباح ایک کدال لے کر دیا اور کھود نا شروع
کر لگا تھا ہی کھودتے میں ا دوست رہوں ادھ گھنٹہ کی محنت سا رکے بعد دیوار سے
کا گڑ بھر لیا اور تین پرتا پیر چھوٹ کر نیچے گر پڑا اٹھا سکی تک وہ کلدکا مایا پڑی
ہوئی تھی جیسے سمسکی تہ میں موتی کی سیپ پڑی ہو جیسے جھٹ جا کے نکال لیا ادھر ادھر
کھولا شکے سے آنکال کر ہاتھ میں پھرا امعطا ہو سہ کر وہ مار تکے میں اس دستے مرحے حایل
احساس کی واقع ہو گئی تھی نہ لہذا کسی کرنا بے پر بھی اس کا علاج یہ رہا مگر اس کی آرمیں
سے اس حشو سے پن کا اہل حال کی ہوا ہی کے حاضر کر دیے کے لئے کی کو کنوئیں میں ڈال دیا
حصہ طویل ہے میں نے کیسے عمل ہوتا کیسے گز کالا اور خشک حالی ہو جانے پر کیسے اسے چھوڑا
اور اس کے گرتے وقت کو کنوئیں میں پھینکے اور اماں آئیں تو میں سے کیسے رو رو کر
ان سے تنکے کے چوری جانے کی داستان کہی نہ بیان کرنے لگوں تو سعادت جو میں آج
کھینے بیٹھا ہوں نا تمام رہ جائے

نہ ہوتا تھا، گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹکتا، اپنے کو کوستا، نفرین کرتا، گڑ کھاتو یے ہو، اگر برسات
میں سارا جسم سڑ جائے گا، گندھک کا مرہم لگائے گھومو گے، کوئی تمہارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند
نہ کرے گا، قسمیں کھاتا، علم کی، ماں کی، مرحوم باپ کی، گڑ کی، ایشور کی، مگر ان کا بھی وہی حشر ہوتا
دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے ہانڈی ختم ہو گئی، اس دن میں نے بڑے خشوع و خضوع کے
ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی، بھگوان یہ میرا چنچل لوبھی من مجھے بہت پریشان کر رہا ہے،
مجھے شکتی دو کہ اس کو قابو میں رکھ سکوں، مجھے اشٹ دھات کا لگام دو جو اس کے منہ میں
ڈال دوں، یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھڑکیاں سنوانے پر تلا ہوا ہے، تم ہی میری رکشا
کرو تو بچ سکتا ہوں، میری آنکھوں سے اس ذوق عبودیت میں دو چار بوندیں آنسوؤں کی
بھی گریں، لیکن ایشور نے بھی کچھ سماعت نہ کی، اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی یہاں تک
کہ دوسری ہانڈی کی مرتیہ خوانی کی نوبت آ پہنچی، حسن اتفاق سے انہیں دنوں تین دن کی
تعطیل ہوئی، اور میں اماں سے ملنے ننھیال گیا، اماں نے پوچھا، گڑ کا مٹکا دیکھ لیا ہے، چیونٹے
تو نہیں لگے، سیل تو نہیں پہنچی، میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت
دیا، اماں نے مجھے غرور کی نظروں سے دیکھا، اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی
نکال لینے کی اجازت دے دی، ہاں تاکید کر دی کہ مٹکے کا منہ اچھی طرح بند کر دینا، اب تو مجھے
وہاں ایک ایک دن ایک ایک جگ معلوم ہونے لگا، چوتھے دن گھر آتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا
وہ مٹکے کو کھول کر ہانڈی بھر گڑ نکالنا تھا، یک بارگی پانچ پنڈیاں اڑا گیا، پھر وہی گڑبازی شروع
ہوئی، اب کیا غم ہے، اماں کی اجازت مل گئی تھی، میاں بھیجے کو تال، اور آٹھ دن میں ہانڈی غائب
آخر میں نے اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھڑی کے دروازہ پر قفل ڈال دیا اور
اس کی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی، اب دیکھیں تم کیسے گڑ کھاتے ہو، اس قفل
میں سے کنجی نکالنے کے معنی یہ تھے کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے اور یہ ہمت مجھ میں نہ تھی
مگر تین دن میں ہی صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا، اور ان تین دنوں میں بھی دل کی جو حالت تھی وہ

میں گڑ کا صفایا کر دیتا تھا یہی گڑ کے دن سے متاثر تھے، اماں کو پتا بھی چل گیا تھا میرا امتحان قریب
تھا اس لیے میں ان کے ساتھ سفر نہ کر سکا سو کو وہ لیتی گئیں، جاتے وقت انہوں نے ایک من
گڑ لے کر ایک مٹکے میں رکھا اور اس کے منہ پر ایک سکورا رکھ کر مٹی سے بند کر دیا مجھے سخت
تاکید کر دی کہ مٹکا نہ کھولنا، میرے لیے تھوڑا سا گڑ ایک ہانڈی میں رکھ دیا تھا وہ ہانڈی میں نے
ایک ہفتہ میں صفاچٹ کر دی، صبح کو دودھ کے ساتھ گڑ دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گڑ سہ
پہر والیوں کے ساتھ گڑ، رات کو پھر دودھ کے ساتھ گڑ، یہاں تک تو جائز صرف تھا اس پر اماں کو بھی
کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا مگر مدرسے سے بار بار پانی پینے یا پیشاب کرنے کے بہانے گھر میں آتا اور
تھا ایک مٹھی گڑ نکال کر کھا لیتا، اس کی بحث میں کہاں گنجائش تھی، اور مجھے گڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا
تھا کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا، میں گھر میں آتا گڑ کے سرشار ہو جاتا، ایک ہفتہ میں ہانڈی نے
جواب دے دیا، مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی، اور اماں کے گھر آنے میں ابھی پورے تین مہینے باقی
تھے، ایک دن تو میں نے طوعاً و کرہاً صبر کیا، لیکن دوسرے دن ایک تلخ سے ہماری اور مٹکے کی
ایک نگاہ مشرق کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا، میں نے کسی گناہ کے احساس کے ساتھ مٹکے
کو کھولا اور ہانڈی بھر گڑ نکال کر اسی طرح مٹکے کو بند کر دیا، اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین
ہفتہ چلاؤں گا، چلے یا نہ چلے، گر میں چاہے جاؤں گا مٹکے کو ہرگز ہاتھ نہ لگاؤں گا جسے رستم
بھی نہ کھول سکتا تھا میں نے مٹکے کی پنڈیوں کو کچھ اس طرح چھپا کر رکھا جیسے بس دو کا شمار
ماسواؤں کو ڈس رہے ہیں، لیکن ہانڈی گڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا، اماں کو
ابھی ڈیڑھ مہینہ آنے کا ہوا اور دل تو سمجھے آئے گی، گرمیاں اور برسات میں وہ کشمکش شروع ہوئی کہ
کیا کہوں، ناسپاسی یا بیماری کے ہاتھ رہی یہ دو گلی کی بنا ہر دل جیسے شہر و دیہات کو
پکار رہی، جیسے ملٹری سڑک کو کھاتے، اس کو مرگ آسمان میں اترنا ہے اور فلک ہو ملاک کے
مصرے پہ مطلب اور اپنے رحم میں ترحم کر بھی کچھ نہیں سمجھ اپنا مارا وہ کر تا دل بھر ہی
پلاپ چھٹا پہلے سے زیادہ نہ کھاؤں گا لیکن یہ ارادہ سرا سروں کی تہ سے زیادہ دیر پا

خوانچے والا پوچھتا ہے، کیا لوگے ؟
میں کہتا ہوں، کچھ نہیں۔
اور آگے بڑھ جاتا ہوں، دو دکان بھی ملی تو شراب کی، گویا دنیا میں انسان کے لیے شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے، یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہوں گے، دوسرا کون شراب پیتا ہے، دیہات میں، مگر وہ مٹر کا دلآویز سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے، اور میں بھاگا جا رہا ہوں۔

کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا ہے، ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اسے یہیں سڑک پر پٹک دوں، اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہو گا، مگر اس وقت وہ مجھے من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے، جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے، یہ رنماسی کا چاند درختوں کے اوپر جا بیٹھا ہے اور پتیوں سے زمین کی طرف جھانک رہا ہے، میں بالکل اکیلا چلا جا رہا ہوں، مگر خوف بالکل نہیں ہے، بھوک نے ساری حسیات کو دبا رکھا ہے، اور بھوک ان پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی، کہیں تازہ گڑ پک رہا ہے، کوئی گاؤں قریب ہی ہو گا۔ ہاں وہ آموں کے جھرمٹ میں روشنی نظر آ رہی ہے، لیکن وہاں پیسے دو پیسے کا گڑ کون بیچے گا، اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائے گا۔ معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں آگے بڑھتا ہوں مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے، گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے، جب کبھی کسی چیز کی دکان کھولنے کی سوچتا تھا، تو وہ حلوائی کی دکان ہوتی تھی، بکری ہو یا نہ ہو مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی، حلوائیوں کو دیکھو، مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے، لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں، آرام طلبی کے باعث توند نکال لیتے ہیں، میں ورزش کرتا رہوں گا، مگر گڑ کی وہ صبر آزما اور اشتہا انگیز خوشبو برابر آ رہی ہے۔ مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے جب اماں تین ماہ کے لئے اپنے میکے یا میری ننھیال گئی تھیں۔ اور میں نے تین مہینے میں ایک

جب میں اس کمرے سے باہر آیا سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی، حالانکہ سڑک کا
پلٹ بالکل اندھیرے میں چھپ کر رہ گیا تھا
میں نے تھیلا اٹھایا اور تیزی سے چلا، دونوں طرف چنے کے کھیت تھے جن کے اٹھے
ہوئے پودوں پر شبنم کا ہلکا پردہ پڑ چلا تھا، بے اختیار ایک کھیت میں گھس کر بوٹ اکھاڑ لے
اور ٹونگتا ہوا بھاگا

(۲)

سامنے بارہ میل کی منزل ہے، کچا مسلسل راستہ، شام ہو گئی ہے مجھے پہلی بار اپنی
غلطی کا احساس ہوا لیکن جوش کھلی نے کہا کیا مضائقہ ہے، ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں
بارہ کو دل میں دو دو سے ضرب دیا، میں بیر ادھر گرا ہی لو ہوئے ہیں بارہ میل کے معاملے میں
میں ہر اگر کچھ بکھا آسان معلوم ہو دے، اور جب گھر دو تین میل رہ جائے گا سالوں کی
طرح سے لے گا وہ ہی پہنچ جاؤں گا اس کا کیا شمار بہت رہ گئی، آگے دیکھا ساڑھی پیچھے
چلے کر ہے یہ اور بھی اطمینان ہوا
اندھیرا ہو گیا ہے، میں تھکا ماندہ ہوں، سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی
نظر آئی ہے، ایک کپی جل رہی ہے ضرور کسی شے کی دوکان ہوگی، اور کچھ نہ ہوگا تو گڑ اور چنے
تو مل ہی جائیں گے، قدم اور تیز کرتا ہوں، جھونپڑی آتی ہے، اس کے سامنے ایک لمحہ کے لئے کھڑا ہو
جاتا ہوں، چار پانچ آدمی زمین پر آگ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں، بیچ میں ایک چولہا ہے، ہر ایک کے
سامنے ایک ایک کلھڑ، دیوار سے ملی ہوئی اونچی گدی ہے اس پر ساہو جی بیٹھے ہوئے ہیں
ان کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں، اسا اور پیچھے ہٹ کر ایک آدمی کڑھائی میں سے کچھ
سر پھل رہا ہے، ماس کی بدبو اور اس مد کی جو سمو سے جسم میں برقی رو سے دوڑ
جاتی ہے، بے اختیاری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک پیسہ نکال کر اس کی طرف چلتا ہوں
لیکن آپ ہی قدم رک جاتے ہیں یہ کلوار ہے

میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے سر کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی، جی میں تو آیا کہ چل کر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں، مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے کے لئے تیار ہو گیا، کل بارہ میل ہی تو ہیں، اگر دو میل فی گھنٹہ بھی چلوں تو چھ گھنٹہ میں گھر پہنچ سکتا ہوں، ابھی پانچ بجے ہیں، ذرا قدم بڑھاتا جاؤں تو دس بجے یقیناً پہنچ جاؤں گا، اماں اور منو میرا انتظار کر رہے ہوں گے، پہنچتے ہی گرم گرم کھانا ملے گا، کولھواڑے میں گڑ پک رہا ہوگا وہاں سے گرم گرم رس پینے کو آجائے گا، اور جب لوگ سنیں گے، میں اتنی دور سے پیدل چلا آیا ہوں تو انہیں کتنا تعجب ہوگا، میں نے فوراً گنگا کی طرف قدم بڑھایا، یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا، اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی، مجھے اس راستہ سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے، تردد کی کوئی بات نہ تھی، دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا۔ بارہ میل کہنے کو ہوتے ہیں، ہیں تو کل چھ کوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے، میں کود کر جا بیٹھا، کھیوے کے پیسے بھی نکال کر دے دیئے لیکن ناؤ ہے کہ وہیں قطب بنی ہوئی ہے، مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے، کیسے کھلے لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔

اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر بھنا جاتا ہوں، سورج نیچے دوڑا چلا جا رہا ہے، گویا مجھ سے بازی لگائے ہوئے ہے، ابھی سفید تھا، پھر زرد ہونا شروع ہوا، اور دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گیا، دریا کے اس پار افق پر لٹکا ہوا تھا، گویا کوئی ڈول کنوئیں میں لٹک رہا ہو، ہوا میں کچھ خنکی بھی آگئی، اور بھوک بھی معلوم ہونے لگی، میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور ولولے میں روٹیاں نہ پکائی تھیں، سوچا تھا شام کو تو گھر پہنچ جاؤں گا، لاؤ ایک پیسہ کے چنے لے کر کھا لوں، ان دانوں نے اتنی دیر تک نور فاقت کی، اب پیٹ کی پیچیدہ گیوں میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے، مگر کیا غم ہے، رستے میں کیا دکانیں نہ ہوں گی، دو دو چار پیسے کی مٹھائیاں لے کر کھا لوں گا۔

ہولی کی چھٹی

ورنیکلر فائنل پاس کرلینے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی جو میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا، ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا، رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسہ میں آجاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب چارپائی پر لیٹ کر اپنے خراٹوں سے انہیں پڑھایا کرتے، جب لڑکوں میں دھول دھپا شروع ہو جاتا اور شور و غل مچنے لگتا تب یکایک وہ خواب خرگوش سے چونک پڑتے اور لڑکوں کو دو چار طمانچے لگا کر پھر خواب نوشیں کے مزے لینے لگتے، گیارہ بجے رات تک یہی ڈرامہ ہوتا رہتا، یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بے قرار ہو کر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے، اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا، اس لئے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی، نائٹ مدرسوں پر اتنی عنایت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انہیں نہ طلب کیا جاتا تھا، مگر تعطیلیں بالکل نہ ملتی تھیں، سوم وتی اماوس آیا اور نکل گیا، بسنت آیا اور چلا گیا، شیو راتری آئی اور گذر گئی، اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک دن کے لئے کون اتنا بڑا سفر کرتا، اس لئے کئی مہینوں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا مگر اب کے میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا، چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں، میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دیدیا کہ ۲۰ مارچ کو ہولی کی تعطیل شروع ہوگی، اور بندہ ۱۹ کی شام کو رخصت ہو جائے گا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو، تمہیں کیا معلوم نوکری کتنی مشکلوں سے ملتی ہے، اور کتنی مشکلوں سے بنتی ہے، نوکری پانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا نبھانا، اپریل میں امتحان ہونے والا ہے، تین چار دن مدرسہ بند رہا تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے، سال

لطف نہیں، وہ اس سے محروم ہو گئی، وہ نوزائیدہ فرشتے کو گود میں اٹھا کر آنکھوں میں غرور اور پیار اور تشکر بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اسے جھبلا کی گود میں نہ دے سکی اس کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔

(۶)

صبح ہوئی جھبلا نہیں آئے، شام ہوئی، رات ہوئی، پھر صبح ہوئی پھر شام ہوئی، یہاں تک کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں، جھبلا نہ آئے، نہ کچھ کہہ گئے نہ کوئی خط دے گئے، پدما مارے فکر اور خوف کے سوکھی جاتی تھی۔

ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا، کچھ روپے نکلنے تھے، منشی جی بینک سے ناکام لوٹ آئے، بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھبلا نکال لے گئے، پدما نے انہیں بینک سے لین دین کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔

اس نے تعجب سے پوچھا، مگر میرے بیس ہزار جمع تھے۔

"جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے۔"

"اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے؟"

"جی وہاں تو کسی کو کچھ خبر نہیں۔"

پدما اسی طیش سے جھبلا کے کمرہ میں گئی، اور اس کی قد آدم تصویر جو ایک ہزار میں بنوائی تھی، اٹھا کر اتنے زور سے ٹپکا کہ شیشہ چور چور ہو گیا، پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑا اور اسے پیروں سے خوب کچلا اور دیا سلائی لگا دی، پھر جھبلا کے کپڑے، کتابیں، صندوق، جوتے، سگریٹ کیس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ اور بلند آواز میں بولی، سنہرا، مار عاشق ترام خور، خردماغ، خرنفس، ۔ ابی جھبلا! تم تم۔

ہاں ڈاکٹر جھبلا جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے، اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں

رہتا، بار بار ہی ڈوب جاتا، کرب سے بے ہوش ہو جاتی، روتی تھی تڑپتی تھی
ملن پسینے میں تر معلوم ہوتا تھا جان نکل جائے گی اچانک وہ بار بار چیختی، جیسے انہی کے
پاس اس درد کا علاج ہے، ہاں اگر وہ آکر کھڑے ہو جاتے، اس کا سر سہلاتے، اسے پیار کرتے
تو وہ اس سے بھی بڑا درد جھیل لیتی، ہاں جھیل لیتی، لیکن وہ کہاں ہیں؟ ابھی تک نہیں آئے
اب تو بارہ بجے ہوں گے۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا ساڑھے بارہ ہیں

"اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں، کوئی ذرا جا کر انہیں بلا لائے"

کہاں گئے، کچھ آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں مجھے معلوم نہیں، اگر کسی کو بھیج دو تلاش کروائے"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا آپ لئے کو اس طرح پریشان نہ کریں اس سے درد اور بڑھ
جائے گا، چپ ہو گئی، پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہو گئی، احساس ہوش کا تو بولی، میں اب
نہ بچوں گی، اس کم بخت درد میری جان لے کر رہے گا، پیغام لا دو آئیں تو کہہ دینا میں نے انہیں
معاف کیا، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں کہ آپ انہیں دے دیجے گا اور میری طرف سے
کہنا اسے پالو، یہ تمہاری بد نصیب ہما کی نشانی ہے

اور اسے معلوم ہوا جیسے تاریک ترین کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا

اس کی آنکھیں کھلیں تو کہاں، کہاں، کہاں ان کی ہوش آمد پیاری، ننھی جان کس
صلار صدا کانوں میں آئی، لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا، جیسے اس کی آنکھوں
میں ٹھنڈک آ گئی، اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل اور جگر تک پہنچ گئی اس نے ہاتھ
بڑھا کر بچے کو گود میں لے لیا اور بولی سلام آ گئے اس ابھی تک نہیں

اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا جیسے چراغ گل ہو جائے، زندگی کی سب سے بڑی مسرت
اس کے سامنے اور سب کچھ ناچیز تھا، نام و ادا، ناز و سنگار، لوگ دکھاوا، کہیں یہ

ہے، انہیں اب اس سے گریز ہوتا تھا، ان کے لئے اب یہاں دل لگی کا کوئی سامان نہ تھا، جانتے تھے ہی کہ پدما ان کی لونڈی ہے، پھر وہ کیوں نہ لطف زندگی اٹھائیں، کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

پدما اپنے کمرہ میں اداس بیٹھی رہتی، وہ سیر کرنے نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اس نے شکایت کی، تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو، تمہیں خیال بھی نہیں ہوتا، مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

جھلا نے منہ بنایا، اچھا اب آپ کو ذرا سا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے بے اعتنائی سے بولے، تو کیا چاہتی ہو، کہ میں تمہارے آنچل سے بندھا رات دن بیٹھا رہوں۔

"کچھ ہمدردی تو چاہتی ہی ہوں۔"

"میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"

پدما خاموش ہوگئی، بدمزگی ہوجانے کا اندیشہ تھا، وہ اپنے تئیں اب اور بھی ان کی محتاج پاتی تھی، کہیں ناراض نہ ہوجائیں، کہیں چلے نہ جائیں۔ اس خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔ رتنا کا بھی خوف تھا، وہ آج بھی رقیبانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے جھلا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دے گی، اسے کتنا ذلیل کرے گی، وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی تو جہاں ناکام ہوئی، میں وہاں کامیاب ہوں، تو نے جھلا کو حسن سے باندھنا چاہا، ناکام ہوئی، میں نے انہیں اپنی محبت سے باندھا، اور باوجود کسی رسمی یا قانونی یا روحانی معاہدہ نہ ہونے کے اب تک باندھے ہوئے ہوں، وہ سب کچھ جھیل کر بھی محبت کی فتح دکھانا چاہتی تھی، اسے اپنے سے زیادہ فکر اس نظریے کی فتح کی تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی، لیڈی ڈاکٹر آئی، نرس آئی، دایہ آئی، جھلا کا کہیں پتہ

چاہیں خرچ کریں اور جس طرح چاہیں خرچ کریں وہ مطلق معترض نہ ہوتی تھی، انکے لئے ایک نہ ایک تحفہ روز ہی لاتی رہتی تھی، ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے سے بڑے رئیس کے پاس بھی نہ ہوگی، ان کے لئے ایک علیحدہ کار تھی، دو بیرے الگ، نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو، ذرا سی شکایت ہوئی اور نوکر گئے، روز ان کے لئے اچھی اچھی شرابیں آتیں، پدما کو بھی شراب کا چسکا پڑ گیا تھا جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے۔

اور اتنا ہی نہیں، پدما جھلا کی رضا کی چیری تھی، جھلا کا نام ہی جھلا نہ تھا مزاج کے بھی جھلے تھے، ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے اور پدما ان کا منا دن کرتی، ان کا غصہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا، جھلا کو اپنی طاقت کا علم تھا، اور اس کا اظہار کرتے تھے، پدما کو اپنی کمزوری کا علم نہ تھا، وہ اسے بخوبی سمجھتی تھی۔ محبت میں جبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے اور صبر کرنے کی بھی بے انتہا قوت ہے جھلا جبر کرتے تھے، پدما صبر کرتی تھی، جھلا کا ایک تبسم، شکریہ کا ایک لفظ یا محض مسرت خاموش، اسے باغ باغ کرنے کے لئے کافی تھی، سیاسیات کی طرح آئین محبت میں ایک حاکم ہوتا ہے، دوسرا محکوم، محکوم پسینہ نکالتا ہے، مرتا ہے سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا۔ حاکم سزائیں دیتا ہے، رعب جماتا ہے، رلاتا ہے، اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت میں آ جاتے تھے، وہی پدما ہے، وہی غرور کی پتلی وہی نازک مزاج، افسوں طراز، مگر کتنی متحمل ہو گئی ہے، اس طرح تو کوئی بوالہوس مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا، کیا بوٹی سنگھا دی ہے اس ڈاکٹر نے، دل جلے حاسد پدما پر آوازے کستے، پدما ہنس کر رہ جاتی تھی، اس کے مارے ہوئے جو عشاق تھے انہیں اس کی بے زبان حلقہ بگوشی دیکھ کر مسرت ہوتی تھی، کہتے تھے، جیسے کو تیسا۔

ایک دن جھلا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا۔ جھلا نے غضبناک ہو کر پوچھا "میرا خط کس نے کھولا؟"

دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا۔

پدما ہنس کر بولی، اس کا ذکر نہ کیجئے وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔

"تو کیا میں یہ باور کر لوں کہ آپ فی الواقع مجھے اتنا مکروہ انسان نہیں سمجھتیں!"

"اس کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی ہوں، مجھے تعجب ہے کہ رتنا سے آپ کی کیوں نہ پٹی!"

"اگر آپ انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہو گی!"

"شادی کر کے خوش رہنے کے لئے جس بے حسی کی ضرورت ہے اتنی شاید رتنا میں نہ تھی!"

"اب مجھے بھی یہی تجربہ کرنا ہے کہ آزاد رہ کر خوشی مل سکتی ہے یا نہیں! شادی کر کے دیکھ لیا"

"میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے!"

"ذاتی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں!"

پدما نے عشوہ طراز نظروں سے دیکھا۔

"ایسے بے وفاؤں کو زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے!"

"یہ بھول نہ جائیے کہ یہ عدالت نہیں ہے۔"

"صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے!"

"مجھے موقع عطا کیجئے!"

دوسرے دن جھلا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آ جاتے، پدما روز بروز ان کی جانب ملتفت ہوتی جاتی تھی، ان میں وہ سارے اوصاف نظر آتے تھے جن کی اسے بھوک تھی، ان میں خیالات کی مناسبت تھی، نیک نیتی تھی، ایثار تھا، جذبات تھے، اور کوئی ذاتی غرض نہیں۔

ایک دن جھلا نے کہا، میرا جی چاہتا ہے، یہیں آ کر پریکٹس کروں، مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔

پدما نے وکالت شروع کرتے ہی علیحدہ مکان لے لیا تھا، ماں کے ساتھ اسے بہت سی نیاروں کی پابندی، شرپا حضوری، اس کے پاس خاطر سے کرنا پڑتی، اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی، وہ کسی کے روبرو جوابدہ کیوں ہو؟ وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے، کسی کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، بیوہ ماں اسی پرانے مکان میں رہتی تھی، تنہا رحوم کی اپاسنا کی پرستش کرتی ہوئی، رتنا شوہر سے علیحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی، لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا، پدما نے خود کوشش کر کے مفصل کے ایک شہر میں اسے ایک مدرسہ میں جگہ دلوا دی، پدما نے تعلیم سے جو سبق اٹھایا تھا اس میں نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا، بندش روح کی بالیدگی کے لئے زہر تھی، فرائڈ اس کا معبود تھا اور فرائڈ کے نظریئے اس کی زندگی کے لئے مستقل ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو، تھوڑے ہی دنوں میں دوران خون بند ہو جانے کے باعث بیکار ہو جائے گا، فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطر میں ڈال دے گا، یہ جو جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے، محض اس لئے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا نفسیات کی یہ ہی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھا۔

اور وہ بڑی آزادی سے اپنی پرسونالٹی کی تکمیل کر رہی تھی، پیشہ کی ابتدائی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد اب اس کی وکالت اسی طرح تھی، جیسے مچھلی کے لئے پانی، بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے، صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا، ان کی پیروی کے لئے کسی قسم کی تیاری یا تحقیق کی ضرورت نہ تھی، محرر ضابطے کی تکمیل کر دیتا، وہ اجلاس پر جا کھڑی ہوتی، اور وہی ہزار بار کی دہرائی ہوئی دلیلیں اور منجھے ہوئے الفاظ، اس لئے اب اسے فرصت بھی کافی تھی، اس کے ہواخواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے دیدار سے محظوظ ہونے کے لئے نئے نئے مقدمات لاتے رہتے تھے اور وکالت کے مسند کی تو وہ دیوی تھی، اور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتے

بی اے میں تو یہی ہی، امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا، قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا
دو سال میں اس نے قانون بھی اول درجہ میں پاس کر لیا، اور وکالت شروع کردی، اس کی ذہانت
اور ذکاوت نے اس کے حسن کے ساتھ مل کر سال بھر میں اسے جونیر وکیلوں کی اولی صف میں بٹھا
دیا، وہ جس اجلاس میں پہنچ جاتی ایک ہنگامہ مچ جاتا، نوجوان وکلا چاروں طرف سے آ کر بیٹھ
جاتے اور ساکانہ نظروں سے اُسے دیکھتے، عدالت بھی اس کی رعنائیوں، اور شیریں بیانیوں سے
بے نیاز نہ رہ سکتی، زاہد طبیعت ججوں کی فطرت بھی مسرور ہو جاتیں، چہروں پر رونق آجاتی،
سبھی اس کی ایک نظر کے متمنی تھے، اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوتی وہ شکستوں سے
ناآشنا تھی، ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا، اس کے مؤکل ملزم کو الزام ثابت ہو جانے پر
بھی سزا بہت نرم ملتی، یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالف، کا شدید ترین مواخذہ
ہوتا اس کے خلاف ڈگریاں بھی ہوتیں، تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا، شرح سود میں معقول
تخفیف ہو جاتی، اور موافق ڈگریوں میں فریق ثانی کی شامت ہی آجاتی، اس کے حسن کا جادو
نامعلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہتا تھا۔

لیکن اس کی دھاک جبھی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر بھلا کے پر
علیحدگی کے لئے دائر کیا، میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہوگئے تھے کہ رتنا کو اب قانون
کے سوا چارہ نہ رہا، اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا، علیحدگی کے لئے جن قانونی اسباب
کی ضرورت ہوتی ہے اُن کا یہاں نشان نہ تھا، لیکن پدما نے کچھ ایسی دقت نظری سے
کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہو گیا، جس وقت پدما اجلاس میں آ کر کھڑی ہوتی اور اپنے مؤثر
لہجہ میں خطیب کامل کی روانی اور انہماک اور استدلال کی وضاحت اور جامعیت کے
ساتھ اپنی تقریر شروع کرتی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے، اور آپس میں کہتے
یہ قدرت کی دین ہے، بلاشک اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غالب
ہوتا لیکن اس میں نفسانیت کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا پختہ رنگ ہوتا کہ عدالت بھی

یکایک کیوں برہم ہو گئے۔

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں شاید میں اتنی حسین نہیں ہوں، یا اتنی سلیقہ دار نہیں ہوں، یا اتنی غلام نہیں ہوں۔ کیونکہ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کی آزادی کا دم بھرنے والے مرد بھی عام مردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی اس فراخدلی کے معاوضہ میں اور بھی کامل، بے زبان اطاعت چاہتے ہیں

پیما نے حقیقت کو اور بھی واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا، لیکن تم دونوں تو ایک دوسرے سے خوب خوب واقف تھے۔

رتنا آنکھیں ہدلی سی بولی یہی تو رونا ہے، ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات اور خیالات سے خوب واقف تھے، برسوں ہم ساتھ رہے تھے، ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے موقعے ہمیں ملے بہت کم کسی کو ملے ہوں گے، ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمینان کر لیا تھا، ظرف میں کہیں شگاف یا درار تو نہیں، آواز اس کی سچی تھی، ٹھوس اور صاف کی آواز کی طرح مترنم، لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے، اور سارا پانی بہ گیا۔ اور اب گھڑا ہوئی تقدیر کی طرح خشک پڑا ہوا ہے، مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے، عورت کے لئے ہی کیوں، مرد کے لئے بھی میں شادی کو اتنا ہی مہلک سمجھتی ہوں، اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہو گئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی، ان کی جن اداؤں اور خوش فعلیوں پر فدا تھی، اب ان سے مجھے نفرت ہے، کیوں دل کی یہ حالت ہے، کہہ نہیں سکتی، لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی۔ وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورپن کی بو آتی ہے باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے، اچکن اور پاجامہ پہنتے ہیں تو مسخرے جیسے لگتے ہیں، کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرنٹا ہو۔ اُن کے ساتھ جتنی

(۱)

پدما کار سے اتر کر اسی بس پر گئے تھی، تو اسے خوشی کے بجائے بدحالی محسوس ہوا۔ وہ
رستہ بھی جیسے اس نے سالہا سال پہلے بچپن کے ساتھ خوش خوش گھر سے آتے دیکھا تھا، شگفتہ
اور پُرنور اور حسین، وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ اسی کے عقبوں سے پدما کو اسلام اور علوم واقفیت ہ
اسے سب کے ساتھ ہوش میں سے اور اس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے لیکن اس کی مرلے ابھی تک
ہو گئی ہے اس کا اسے گمان ہوا جیسے تصویر مٹ گئی ہو، صرف اس کا خاکہ باقی ہو

اس نے پوچھا یہ تمہاری کیا حالت ہے بہن، کیا تم بیمار ہو؟ اپنی بیماری کی اطلاع تو
ہا نہیں بھی دی، رتنا مسکرا کے بولی کیا کرتی لکھ کر، تقدیر میں جو تھا وہ ہوا اور
اب جو ہو گا، تمہیں یا امّاں کو اپنی داستانِ غم سنا کر کیوں رنجیدہ کرتی، گھر سے
ملنے کو دل بہت بے قرار تھا مگر سوائے سلطان کے کہ بلاتا ہے کہ وعدہ کر کے ٹال جاتی تھی
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے پا جاؤں تو خوب پیٹوں، مہینوں کا کھانا جمع ہے ابھی کر دھوئے
کچھ کھا پی کر مضبوط ہو جا

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے۔ وہ بہن کو اس نے صرف ایک پیالہ چائے اور ٹوسٹ
کھلایا تھا، سہ پہر کو ایک سنترہ اور اب شام ہو گئی ہے گاڑی سے اتری تو اس کا جی کچھ کھلنے
کو جا رہا تھا لیکن اب جیسے بھوک غائب ہو گئی ہے۔ البتہ رتنا سے اس کے دل کی باتیں
سننے کی بھوک جاگ گئی ہے۔ اس نے کرسی پر لیٹ کر کہا جیجی تو تم سے بڑی محبت کرتے

ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے، جس میں سب ملاکر نو آدمی تھے، یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم میرے قریب آگئے، اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤگے، میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادتمندی پر نادم ہوکر باچشم نم کہا ہرگز نہیں، آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے، اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا، میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے، کروں کیا، خود بے راہ چلوں تو تمہاری ہدایت کیسے کروں، یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گذرا، اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لمبے تھے اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی۔ اور اسے لئے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

تم ابھی آٹھویں درجہ میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑتے ہو، افسوس ہے
تمہاری اس نا عقلی پر، تم ذہین ہو اس میں شک نہیں لیکن وہ ذہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا
وقار کھو بیٹھے، تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انہیں
مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، میں تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، میں تم سے پانچ
سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آ جاؤ، اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً
اگلے سال تم میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ، لیکن مجھ
میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا، خدا بھی نہیں مٹا سکتا، میں تم سے پانچ
سال بڑا ہوں، اور ہمیشہ رہوں گا، مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کی برابری
نہیں کر سکو گے چاہے تم ایم اے اور ڈی لٹ اور پی ایچ ڈی کیوں نہ ہو جاؤ، عقل کتابیں پڑھنے
ہی سے نہیں آتی، ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں جماعت
سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں
سمجھانے کا ہمیشہ اختیار رہے گا، محض اس لیے نہیں کہ وہ ہمارے جنم داتا ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے
زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے، امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں
کیں، آسمان میں کتنے ستارے ہیں، یہ باتیں انہیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی
باتیں ہیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے، آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے
ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے، سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا لیکن تمہاری جگہ
دادا ہوں تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ پہلے خود مرض کو پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر
اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے، گھبرائیں گے نہیں بدحواس نہ ہوں گے،
ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم تم بیس بائیس تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو
محتاج ہو جاتے ہیں، ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں، لیکن جتنا
آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی سے

ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر میری فضیحت کر سکیں گے، لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا، آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لئے، مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنا دن پاس ہوتا جاتا ہوں۔ اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے، کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انہوں نے تحمل سے کام لیا، شاید اب انہیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب، نہیں نہیں رہا، یا رہا تو بہت کم، میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی، میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا، پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے، اس لئے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑا بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا، وہ بھی جاتا رہا مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا، اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا، ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں، میں انہیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی توقیر اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مٹ بھیڑ ہو گئی، شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے، انہوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے، ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لئے دوڑتے تمہیں شرم نہیں آتی، تمہیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو۔ اور مجھ سے صرف ایک درجہ نیچے ہو، آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیئے، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے، میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں، کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی۔ اے اور ایم۔ اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیروں میں اور

سر بھی دوڑتے اور آہستہ آہستہ بھی، یہ سمجھا دماغ نہیں کہ یہ بھی کچھ سکتا ہے، لیکن ان لسٹر کو کوئی بھی سر نہیں اس پر طرہ یہ کہ ہم ماسٹریں سب سے درجے میں آگے، اور یہ ماسٹر جیلے ہنگے اب تم نے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا، اس درجے میں اول آ گئے ہو تو اتنا اتراتے ہو، اگر آگے جا ملے، تو کیا حال ہوگا، لیکن میں تم سے بڑا ہوں، دنیا کا تجربہ زیادہ مجھے حاصل کیا ہے، اگر کہا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو، ورنہ پچھتاؤ گے

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ ... یہ نصیحت کب ختم ہوتی، مجھے آج کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا، جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو نہ معلوم شاید نکال دیں گے، انھوں نے بڑے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی اس نے مجھے ہیچ کر دیا، کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا، یہی تعجب ہے، لیکن اب تک سوتے ہیں بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی، کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا، پڑھتا بھی تھا مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے، اور درجے میں ذلیل نہ ہونا پڑے، اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا، وہ پھر غائب ہو گیا، اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(۳)

پھر سالانہ امتحان ہوا، اور کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بیچارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے، میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر معلوم نہیں کیسے درجے میں اول آگیا، مجھے خود تعجب ہوا، بھائی صاحب نے جان توڑ محنت کی تھی، دن کے رات تک ادھر چار بجے صبح سے، پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک اسکول جانے کے پہلے، چہرہ زرد ہو گیا تھا، مگر فیل، مجھے ان پر رحم آتا تھا، نتیجہ سنایا گیا، تو وہ رو پڑے اور میں بھی رونے لگا

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا تھا، میرے دل میں ایک بیہودہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں

کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے، میرے فیل ہونے پر مت جاؤ، میرے
درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا، جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے
اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی، بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان نہیں، آٹھ آٹھ
ہنری ہو گذرے ہیں، کون سا واقعہ کس ہنری کے زمانہ میں ہوا؟ کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو
ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھواں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی! ہو کس
خیال میں، درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں، درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا
ہے، ان کمبختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے، ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے
چلے گئے، اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ! ا ب ج کی جگہ ا ج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ
گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر ا ب ج اور ا ج ب میں کیا فرق ہے
اور کیوں اس مہمل بات کے لئے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال
روٹی بھات میں کونسا فرق ہے، مگر ممتحنوں کو کیا پروا، وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے
چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں، اسی رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے، اور آخر ایسی بے
سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا، اس خط پر وہ عمود گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہوگا
پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے، آٹھ گنا ہو جائے، میری بلا سے، لیکن پڑھنا
ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی، انگریزی مضامین لکھنے پڑتے ہیں، کہہ دیا "وقت کی
پابندی" پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو، اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے
کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے، لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھیے؟ جو بات ایک
جملہ میں کہی جا سکے اس کے لئے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت، میں تو اسے حماقت کہتا ہوں، مگر نہیں
آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھئے، اور صفحے بھی پورے فلسکیپ سائز کے، یہ لڑکوں
پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ظالم اس پر یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو، ایک

اُن سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا۔
ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی کے
کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا، اگر انہوں نے پھر فضیحت کی تو صاف کہہ دوں گا
اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا میں تو کھیلتے کودتے درجے میں اول آگیا زبان سے یہ ہیکڑی
جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے رنگ ڈھنگ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی
صاحب سے اب اتنا مرعوب نہیں ہوں بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز
جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کرکے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب
نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے، دیکھتا ہوں اس سال پاس ہوگئے اور
درجے میں اول آگئے تو اب تمہیں دماغ ہوگیا ہے مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا
تمہاری کیا ہستی ہے، تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا اس کے چلن سے تم نے کون
سا سبق نکالا یا یونہی پڑھ گئے، محض امتحان پاس کرلینا تو کوئی بڑی چیز نہیں، اصل چیز ہے
تاریخ سے سبق حاصل کرنا راون ساری دنیا کا مالک تھا ایسے راجاؤں کو چکرورتی کہتے ہیں آج کل
انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے، راون چکرورتی راجہ تھا
بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے، آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے، مگر اس
کا انجام کیا ہوا غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا، کوئی اسے ایک چلو پانی دینے والا تک
نہ بچا، انسان اور جو کچھ کرے مگر غرور نہ کرے، دونوں دنیا سے گیا، شیطان کا حال بھی
پڑھا ہوگا، اسے بھی غرور ہوا تھا کہ خدا کا اس سے بڑھ کر سچا بندہ کوئی ہے ہی نہیں، آخر یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا گیا، شاہ روم
نے بھی ایک بار غرور کیا تھا، بھیک مانگ مانگ کر مر گیا، تم نے تو ابھی صرف ایک درجہ پاس
کیا ہے، اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے بڑھ چکے، یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں
پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں

کمال تھا، ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی
اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا تھا، اور ذرا دیر کے لئے مجھ پر مایوسی غالب
آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں، جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں
اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا، ٹائم ٹیبل
بناتا، صبح اٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرنا، پھر انگریزی مطالعہ سات آٹھ تک، حساب آٹھ سے
نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جاتا، ساڑھے تین بجے سکول سے واپس آ کر آدھ
گھنٹہ تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے
سات تک، انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اردو، دس کر
گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنالینا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات، پہلے ہی دن سے اس
کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی، میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلآویز ہریالی، وہ پرلطف
آزادی، مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی، اور پھر بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے
کا موقع مل جاتا، میں ان کے سایہ سے بھاگتا، ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا،
کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہو، ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح
فنا ہوئی، ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی، کتابوں سے نفرت
سی ہوتی جاتی تھی۔

(۲)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے، میں پاس ہو گیا، اور درجہ میں اول آیا
میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت رہ گیا۔ جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے
ہاتھوں لوں، آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی، مجھے دیکھئے مزے سے کھیلتا بھی رہا
اور درجہ میں اول ہوں، لیکن وہ اس قدر پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان

پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی، وہ نویں جماعت میں تھے، میں پانچویں جماعت میں، ان کی عمر دیکھا
میرے لئے چھوٹا سا منہ بڑی بات تھی

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا پہاڑ تھا، موقع پاتے
ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آ جاتا، اور کبھی کنکریاں اچھالتا کبھی کاغذ کی تتلیاں اڑاتا،
اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا کبھی پھاٹک پر چڑھ کر نیچے کودتے ہیں، کبھی
پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھاتے ہیں، لیکن کمرے میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت
دیکھ کر روح فنا ہو جاتی، اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اس کا جواب
خاموشی کے سوا میرے پاس اور کچھ نہ ہوتا، نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا
باہر کھیل رہا تھا، میری خاموشی اعتراف گناہ تھی، اور بھائی صاحب ہر بار محبت اور
سختی سے ملے ہوئے لہجے میں کہتے، اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے
اور ایک حرف نہ آئے گا، انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، کہ جو چاہے پڑھ لے اس
طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے، یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں خون جلانا پڑتا
ہے تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے، اور میں کہتا ہوں تم کیسے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی نہیں
سیکھتے میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہاری
ہی آنکھوں کا قصور ہے، اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا، روز کرکٹ اور
ہاکی کے میچ ہوتے ہیں میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، اس پر بھی دو دو میں تین
سال ایک ایک درجے میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت
گنوا کر پاس ہو جاؤ گے، مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں، تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے
سڑتے رہو گے، اگر تمہیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا
کھیلو، دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ جھڑکیاں سن کر آنسو بہانے لگتا، جواب ہی کیا تھا، بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں

(۱)

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے۔ انہوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا، جب میں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے، اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے، تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا، وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے، انہیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا۔ اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے، ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے، کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا، نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی۔ اسپیل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل، بھائی، بھائی، رادھے شیام، شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹہ تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا۔ اور ان سے

لگائے بجا دو ان خانہ جنگیوں میں پڑ کر تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اور تمہاری ساتھ میری بھی، جھٹکے سے جا کر شیریں بانو کو سلام کر دو اور کہو کہ جا کر اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں۔ مسرت کامل کا دنیا میں وجود ہی نہیں، مشیت اتنی بے انصاف نہیں کر سکتی۔ جس طرح غم میں کچھ خوشی ہوتی ہے اسی طرح خوشی میں کچھ غم بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر مسرت کا لطف اٹھانا ہے تو اس کے کانٹوں اور داغوں اور خامیوں کے ساتھ اٹھانا پڑے گا۔ ابھی سائنس نے کوئی ایسی ایجاد نہیں کی جس سے ہم مسرت کو اس کے کانٹوں سے علیحدہ کر سکیں۔ مفت کا مال اڑانے والوں کو عیاشی کے سوا اور کیا سوجھے گا۔ دولت اگر ساری دنیا کی لذتوں کو خریدنا چاہے تو وہ دولت ہی کیسی۔ اس کی اشتہائیں سیر نہیں ہوتیں، کبھی نہیں۔ کیا شیریں کے لئے بھی وہی دروازے نہیں کھلے ہیں جو شاپور جی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سے کہو شاپور جی کی چھاتی پر مونگ دلے۔ اس کی دولت سے حظ اٹھائے اور بھول جائے کہ وہ شاپور کی بیوی ہے۔ اسی طرح جیسے شاپور بھول گیا ہے کہ وہ شیریں کا شوہر ہے۔ اعلانیہ اور کھلا چھوڑ کر دولت کے مزے لوٹے۔ اس کی دولت ایک سے ایک حسین اور رنگین مزاج نوجوانوں کو کھینچ لائے گی۔ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ ایک زمانہ میں فرانس میں باثروت اور عیاش عورتوں کا سارے سماج پر راج تھا۔ ان کے شوہر سب کچھ دیکھتے تھے اور منہ نہ کھول سکتے تھے، وہ خود اسی دھن میں مست تھے۔ یہی دولت کا نتیجہ ہے آج سے نہیں ازل سے۔ تم سے نہ بنے تو چلو میں شیریں کو سمجھا دوں، عیاش مرد کی بیوی اگر عیاش نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی اور بے شرمی ہے۔

کاؤس جی کے لئے یہ فلسفہ بالکل اچھوتا تھا۔ گلشن کی ذکاوت نے کبھی اتنی اونچی پرواز نہ کی تھی۔ حیرت میں آ کر بولے، لیکن تم بھی تو دولت کے پرستاروں میں ہو۔

گلشن نے شرمندہ ہو کر کہا، یہی تو زندگی کی لعنت ہے، ہم اسی چیز پر لپکتے ہیں جو ہمیں جہنم اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں بابا کے ساتھ عرصہ تک دیہات میں رہی ہوں وہاں چاروں طرف مزدور اور کسان رہتے تھے۔ بچارے دن بھر پسینہ بہاتے تھے، شام کو جیسے

"مسیم کو میں کعبے کی مانند سمجھتا ہوں"
گلشن نے پھر اُن کے چہرے پر تجسس نگاہ ڈالی، پھر ایک لمحہ کے بعد بولی
"اچھی بات ہے، چلو گھر چلیں"
کاوس جی نے مسکرا کر کہا، تم پھر مجھ سے لڑائی کرو گی
گلشن نے رعب سے کہا، سرکار سے لڑ کر بھی تم سرکار کی عملداری میں رہتے ہو کہ نہیں؟
"ہم اسے کب مانتے ہیں کہ یہ سرکار کی عملداری ہے"
"یہ تو تم محض زبان سے کہتے ہو تمہارا رواں رواں اسے تسلیم کر رہا ہے، نہیں تم
اس وقت جیل میں ہوتے"
"تم چلو میں دو منٹ میں آتا ہوں"
"میں اکیلی نہیں جانے کی، آخر سنوں، تم یہاں کیا کر رہے ہو"
کاوس جی نے بہت کوشش کی کہ گلشن یہاں سے کسی طرح چلی جائے لیکن وہ
جتنا ہی اس پر زور دیتا تھا اتنا ہی گلشن ضد پکڑتی تھی آخر مجبور ہو کر کاوس جی کو سارا
اور مسز کھنہ کے جھگڑوں کی داستان کہنی پڑی جس ماجرے میں اس کا اتنا حصہ تھا
اسے اس نے بڑی ہوشیاری سے چھپا دینے کی کوشش کی
گلشن نے الزامی انداز سے کہا، تو تمہیں ان جھگڑوں کی سوا کیا ہوا'
کاوس جی نے فوراً اپنی صفائی دی کچھ نہیں، میری اس میں کیا خطا؟
"تم کیوں بیچ میں پڑے، آخر مسز کھنہ نے تم سے کیوں داد خواہی کی"
"اب یہ تو انسانیت نہیں ہے کہ ایک دوست کی بیوی مجھ سے فریاد کرے
اور میں بغلیں جھانکتا پھروں"
گلشن نے طنز آمیز لہجہ میں کہا جھوٹ بولنے کے لیے بڑی عقل کی ضرورت ہوتی
ہے پیارے اور وہ عقل تم میں نہیں ہے، کچھ تم اتنا اچھا لکھے جاؤ، اور عشق عاشقی کے جھگڑے

ہوتے ہیں یہ تانگے والے، اندھا دھند دوڑاتا چلا جاتا ہے، اچھا اس پر تو کوئی لیڈی صاحبہ سوار ہیں، غالباً آپ کو تانگے پر کار کا لطف اٹھانے کا خبط ہوا ہوگا۔ ارے یہ تو گلشن ہے، ہاں وہی ادھر ہی کی طرف آرہی ہے، انہوں نے تپاک سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور بولے تم اس وقت یہاں کیسے آئیں، میں ابھی ابھی تمہارا ہی خیال کر رہا تھا۔

گلشن نے رقت آمیز لہجہ میں کہا، تمہارے ہی پاس آرہی تھی۔ شام کو برآمدے میں بیٹھی تمہارا مقالہ پڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کب جھپکی آگئی، اور میں نے ایک وحشتناک خواب دیکھا، مارے خوف کے آنکھ کھل گئی، اور تم سے ملنے چل پڑی۔ دل بے چین ہو رہا تھا، تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو، کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ میرا سینہ دھک دھک کر رہا ہے۔ ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

کاؤس جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، میں تو خدا کے فضل سے بہت اچھی طرح ہوں کیا خواب دیکھا تم نے؟۔

"میں نے دیکھا جیسے تم ایک عورت کے پیروں پر سر رکھے ہوئے ہو اور وہ تمہیں پاؤں حقارت سے ٹھکرا رہی ہے، پھر کیا دیکھا کہ پولیس آگئی ہے اور تمہیں گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔"

"کتنا بیہودہ اور مہمل خواب ہے اور تمہیں اس پر یقین بھی آگیا میں تم سے کتنی بار کہہ چکا کہ خواب محض فکرمند دل کے اوہام ہیں۔"

گلشن نے ان کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا، تم مجھ سے چھپا رہے ہو، کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے ضرور، اچھا تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہ تو تمہارے لکھنے کا وقت ہے"

"یونہی ذرا گھومنے چلا آیا تھا۔ اکیلے گھر میں جی نہ لگا۔"

"جھوٹ بولتے ہو، کھاؤ میرے سر کی قسم۔"

"اب تمہیں اعتبار ہی نہ آئے تو اس کا کیا علاج ہے؟"۔

"قسم کیوں نہیں کھاتے ہو؟"

برباد نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف اس آشیانہ کو آباد کر رہی ہوں جس کی اس نے کبھی قدر نہیں کی، تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی، اسی وقت، خوب سوچ لیا، شاپور سے اب میرا کوئی تعلق نہیں نہ دین کا نہ دنیا کا۔

کاؤس جی کو اپنے دل میں ایک رعشہ کا احساس ہوا، گدگدی نہیں تھی، رعشہ تھا، لرزہ کپکپی، بولے لیکن ابھی تو میرے گھر میں کوئی تیاری نہیں ہے۔

شیریں نے بنچ سے اٹھ کر گویا دریا میں کودتے ہوئے کہا، میرے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، تم سب کچھ ہو، ایک ٹیکسی لے لو، میں اسی وقت چلوں گی، تمہارے گھر سے شاپور کو ایک رقعہ لکھ دوں گی، تم مجھ سے سیر ہو گئے، اس لئے جاتی ہوں، پھر نہ آؤں گی۔

کاؤس جی ٹیکسی کی تلاش میں پارک سے نکلے، وہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے، اس بہانہ سے وہ مہلت مل گئی، ان پر اب جوانی کا وہ نشہ نہ تھا جو کبھی کبھی ہمیں گڈھوں میں گرا دیا کرتا ہے، ذلت کے، رسوائی کے، اگر کچھ نشہ ہوا بھی تو وہ اب تک ہرن ہو چکا تھا، بیشک انہیں پریشانی ہو گی۔ تباہی کے سامان بھی ہو سکتے ہیں اور رسوائی کے بھی، شاپور جی ان کے قاتل دشمن ہو جائیں گے، اور انہیں خاک میں ملا دینے کیلئے اپنی ثروت اور اقتدار کے سارے وسائل کام میں لائیں گے، گلشن بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں، وہ گلی گلی، کوچے کوچے میں انہیں رسوا کرے گی، اخباروں میں کہرام مچ جائے گا، حریفوں کی قسمت جاگ اٹھے گی، اس واقعہ کو جلی سرخیوں سے شائع کریں گے، بوالہوسی کے کرشمے، ایک شکاری اڈیٹر کی رنگین مزاجی، نئی تہذیب کا دیوالہ وغیرہ، مگر یہ سب مصیبتیں جھیلنے کے لئے وہ تیار تھے، شاپور جی کی زبان بند کر دینے کے لئے ان کے پاس کافی دلیلیں تھیں، شہادتیں تھیں، گلشن کو بھی طبقۂ اناث میں ذلیل کرنے کا ان کے پاس کافی سامان تھا، شیریں جیسی پاک نفس عورت کے لئے وہ اس سے کہیں سخت آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے خوف تھا تو یہ کہ شیریں کی اس محبت میں قیام بھی ہے، ابھی تک شیریں نے انہیں صرف انصاف اور حق کے وکیل کی حیثیت میں دیکھا ہے، صرف ان کے بیدار مغزانہ مضامین پڑھے ہیں، صرف ان کی

انھیں معاً خیال آگیا، کہ وہ ضرورت سے زیادہ بہکے جا رہے ہیں، شیریں کی روبت آمیز قربانیاں، وہ بے نفس خدمتیں یاد آگئیں، ضبط کرکے بولے، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی سمجھ سے کام لے سکتی ہے، میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کرسکتی ہے وہ احباب سے میری شکایت ہے اتنا مجبوری کا اظہار ہے، اس سے بڑھے قدم اٹھانے کی حماقت اس سے سرزد نہیں ہوسکتی، اس کی نہایت متغیر لِ نہ کرے گی، میں اسے منا لوں گا، عورتوں، عورتوں کو منا لینا بہت مشکل ہے، کم سے کم مجھے تو یہی تجربہ ہے۔

کاؤس جی نے تردید کی، میرا تجربہ تو کچھ اور ہے۔

"ممکن ہے، لیکن آپ کے پاس خالی خولی باتیں ہیں۔ میرے پاس دولت کا تریاق ہے۔"

"انحراف کا اثر تریاق سے رد نہیں ہوسکتا۔"

شاپور جی نے خطرہ کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کرکے کہا، شاید آپ کا خیال درست ہو۔

کئی دنوں کے بعد کاؤس جی کی ملاقات شیریں سے ہوئی، پارک میں وہ اسی موقعہ کے منتظر تھے، ادھر وہ شیریں کے گھر نہ گئے تھے، اندیشہ تھا، شاپور جی بدگمان نہ ہوجائیں، ان کی جنت تعمیر ہوچکی تھی، اس میں صرف شیریں کو مسند پر بٹھانے کی کسر تھی، اس روز سعید کے تصور میں وہ پاگل ہو رہے تھے، بالکل خبر نہ تھی کہ اس جنت کی بنیادیں بالو پر ہیں، یا پانی پر ہیں، امید کا سراب دیکھ کر بڑے بڑے دانا بھی، شیخ چلی ہو جاتے ہیں، گلشن کو انہوں نے میکے بھیج دیا تھا، بھیج کیا دیا تھا، وہ روٹھ کر چلی گئی تھی، جب شیریں ان کی غربت اور بے سروسامانی کی دعوت قبول کر رہی ہے تو گلشن کی ناز برداری کیوں کی جائے، لپک کر شیریں سے ہاتھ ملایا، اور بولے، آپ خوب ملیں، میں تو آج آنے والا تھا۔

شیریں نے شکایت کی آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں، شاید آپ بھی زبانی ہمدردی ہی کرنا جانتے ہیں، آپکو کیا خبر ان چند دنوں میں میری آنکھوں سے کتنے آنسو بہے۔

کاؤس جی نے شیریں کا وہ حسین چہرہ اشتیاق سے چمکتا ہوا اور التجا سے ذہنکس دیکھا تو

کاؤس جی نے زاہدانہ انحکام کے ساتھ کہا۔ میں اسے نہیں مانتا۔

"کیوں"؟

اس لئے کہ میں کسی قسم کی نفسانی تفریح کو اپنی منکوحہ کے ساتھ بے انصافی سمجھتا ہوں

شاپور جی ہنسے، ایک پُر معذرت انداز کے ساتھ بولے، وہی دقیانوسی خیال۔

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا آپ کو واضح ہونا چاہیئے کہ آج کی تہذیب ایک نسل پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرین انصاف ہے، اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کئے جاتے، اب عورت کو مرد سے باز پرس کرنے کا حق ہے"۔

"بالفاظ دیگر اب عورتیں مردوں پر حکومت کر سکتی ہیں"؟

"اس طرح جیسے کہ مرد عورتوں پر حکومت کر سکتے ہیں"۔

"میں اسے نہیں مانتا، مرد عورت کا محتاج نہیں ہے، عورت مرد کی محتاج ہے"!

"آپ کا مطلب یہی تو ہے کہ عورت اپنی گذر اوقات کے لئے مرد کی دست نگر ہے"!

"اگر آپ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اختیار کی عنان سیاست کی طرح مادیات میں بھی ہمیشہ ثروت کے ہاتھ رہی ہے اور رہے گی"۔

کاؤس جی اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھ پڑھ چکے تھے، اور اس کے ہر پہلو پر غور کیا تھا، بولے اس اعتبار سے تو اگر خدانخواستہ کسب معاش کا بار عورت اٹھا رہی ہو تو اسے بھی اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تفریح کر سکے، آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے"۔

شاپور جی کی زندہ دلی نے متانت کی صورت اختیار کی۔

"میں عورت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا"!

"تو یہ آپ کی سراسر بے انصافی ہے"!

"مطلق نہیں، عورت پر فطرت نے ایسی بندشیں عائد کر رکھی ہیں کہ وہ بحد امکان کوشش کرلینے پر بھی مرد کی طرح مطلق العنان نہیں رہ سکتی اور نہ حیوانی طاقت میں ہی مرد کا مقابلہ کر سکتی

"اچھا وہ بات، لیکن مسٹری کوئی تھا؟"

"مسٹر اور میچے والی کہانی کیا آپ نے نہیں سنی؟"

مسز ساہو رکا یک خاموش ہو گئیں۔ سامنے سے شاہد جی کی کار آتی نظر آئی۔ انہوں نے کاویں جی کو مسکراتا اور طنزیہ نظروں سے دیکھا اور دوسرے دروازے سے نکل کر چلی گئیں۔ مسٹر شاہد جی آنکھوں میں ہلکی سرخی اور مسکراہٹ بھرے ہوئے کار سے اترے اور مسکرا کر کاویں جی سے ہاتھ ملایا۔ اور ہاتھ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا میں آج ایک دوست کے گھر گیا دعوت تھی، کھانے میں دیر ہو گئی، کچھ گانے بجانے کا بھی انتظام تھا" میں سوچتا ہوں گھر جا کے

کاویں جی نے طنز آمیز تبسم کے ساتھ پوچھا "کس کے ہاں دعوت تھی مسٹر شاہد؟ بوڑھے لوگوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور اچھے دوست کو [illegible] گا"

انہوں نے جیب سے نوٹ بک نکالی

شاہد جی نے سنبھل کر کہا "ایسی کوئی بڑی دعوت نہیں تھی جی، دو چار بے تکلف دوست جمع ہو گئے تھے۔"

"پھر بھی اس کی خبر تو اخباروں میں آنی چاہئے جس بے تکلف جلسے میں آپ جیسے معزز اصحاب شریک ہوں اسے اخبار والے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے، بالخصوص عام لوگوں کو ایسی خبروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ میزبان کون صاحب تھے؟"

شاہد جی نے اسی طرح پر معنی تبسم کے ساتھ پوچھا "آپ چونکیں گے تو نہیں"

"ہرگز نہیں"

"مس گوہر"

"مس گوہر؟"

"جی ہاں وہی، آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے درد سر کے بعد مجھے تازہ ہونے کے لئے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہے، ورنہ زندگی دوبھر ہو جائے۔"

مجھے پردۂ عصمت کو چاک کر ڈالنے کی تحریک کر رہے ہیں، دیدہ و دانستہ شاید کسی خاص مشائے،
میں نے اب تک ان کی جنونی منظور نہیں کی ہے، لیکن اب پانی سر کے اوپر چڑھ گیا ہے اور میں کسی
تنکے کے سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، وہ جو چاہتے ہیں وہی ہو گا۔ نہیں اس سے کچھ زیادہ
ہو گا، ناموس کی زنجیر سے آزاد ہو کر آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا، آپ ان کے دوست ہیں۔
آپ سے بن پڑے تو انہیں سمجھائیے، میں اس عصمت کی بیڑی کو اب اور نہیں پہن سکتی۔

مسٹر کاؤس جی آنے والی مسرتوں کی ایک جنت بنائے تھے، روشن، پُرفضا، روحانی
خوشیوں سے پُر، بولے، ہاں ہاں، میں ضرور سمجھاؤں گا، یہ تو میرا فرض ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ
میرے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہ ہو، جس کے پاس دولت نہیں اُسے ایک صاحب دولت کو سمجھانے
کا حق ہی کیا ہے، آپ کا خیال درست ہے، ضرور انہوں نے کسی منشا سے یہ روش اختیار کی۔

"یوں تو وہ مجھ پر بڑی عنایت رکھتے ہیں، میری خاطر داری میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے
ان کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔"

"تم نے اتنے دنوں تحمل سے کام لیا، یہی تعجب ہے، کوئی دوسری خاتون ایک دن
بھی برداشت نہ کرتی۔"

"ان کے ساتھ زیادہ سختی نہ کیجئے، مسٹر کاؤس جی یہ عادت تو کم و بیش ہر مرد میں ہوتی ہے
لیکن ایسے مردوں کی بیویاں بھی اسی مزاج کی ہوتی ہیں۔ اور عوض معاوضہ گلہ ندارد
کے اصول پر دونوں اپنے اپنے رنگ میں خوش رہتے ہیں، عملاً نہ ہوں، دلاً ضرور ہوتی ہیں، میں یہ
دعوی سے کہہ سکتی ہوں کہ میری حالت بالکل مختلف ہے میں نے ہمیشہ انہیں اپنا معبود سمجھا ہے۔"

"لیکن جب مرد اس وفا اور تسلیم کی قدر ہی نہ کرے تو مجبوری ہے، مجھے اندیشہ ہے
انہوں نے دل میں کوئی اور تہیہ نہ کر لیا ہو۔"

"اور کیا تہیہ کر سکتے ہیں؟"

"کیا آپ اس کا قیاس نہیں کر سکتیں؟"

کاؤس جی اس معمے کو نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر کہا، آپ کو میں اپنا مہربان سمجھتی ہوں، کاؤس جی آپ سے کیا چھپاؤں؟ میں اب اس زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ میں نے اب تک دل کی آگ دل کے اندر رکھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے باہر نہ نکالوں گی تو شاید میری ہڈیاں تک جل جائیں گی، اس وقت آٹھ بجے ہیں، لیکن میرے رنگیلے پیا کا کہیں پتہ نہیں، رات کا کھانا کھا کر وہ ایک دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے، اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ادھر کئی مہینوں سے یہ ان کی روز کی عادت ہے، میں نے آج تک کبھی آپ سے اپنا دردِ دل نہیں کہا، مگر اس وقت بھی جب میں آپ سے ہنس کر باتیں کرتی تھی، میرا دل روتا رہتا تھا۔ اور میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے پوچھتی ہوں، میرے لئے اب کونسا راستہ ہے، اس نے منتظر نگاہوں سے کاؤس کی طرف دیکھا۔

شیریں کی آنکھیں لبریز ہو گئی تھیں، مگر چہرہ پر ایک جلال سا نمایاں تھا، اپنی بےکسی کا یہ اظہار اسے کتنا ناگوار گذر رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

کاؤس جی نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا، آپ نے ان سے پوچھا نہیں۔

"پوچھنے سے کیا لوگ اپنے دل کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں؟"

"تم سے تو انہیں کوئی بات چھپانی نہ چاہیئے"

"گھر سے انسان بیزار ہو تو کیا کرے"

"مجھے یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے، تم جیسی پاکیزہ صفت خاتون جس گھر میں ہو وہ جنت ہے، شاپور جی کو تو تمہاری پرستش کرنی چاہیئے تھی۔

شیریں مسکرائی، ستم ظریفانہ انداز سے۔ اس تبسم میں رازِ دل تھا۔

"آپ کے یہ جذبات اسی وقت تک ہیں، جب تک آپ کے پاس دولت نہیں ہے، آج آپ کو کہیں سے دو چار لاکھ مل جائیں تو تم یوں نہ رہو گے، نہ تمہارے دل کی یہ

لوگوں کو دکھا رہا گویا اس کی یہ ہو اس دن سے کسی نے اُسے روتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں مگر وہ اسی طرح کرتا ہے، اور اس کی مرد کی ہے اصرف وہ روشاں ہ

بھبھوت اور تلک سے اُسے نفرت ہو رہی تھی، اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ گھر سے نکلا ہی کیوں، تھوڑی سی رسوائی اور تضحیک کے خوف سے؟ نہیں بہیمیت کے زیرِ اثر تھا اور ریا نے اس میں جن شیطانی جذبات کو برانگیختہ کیا تھا، ان سے مغلوب ہو کر، اور آج ایک معصوم مظلوم آتما کے اعتقاد اور اعتماد میں اس نے اپنی کھوئی ہوئی حقیقت کو پھر پا لیا تھا، ایسا خوش تھا گویا وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہو ایک نئی سحر کا طلوع اس کی روح کو ایک نورانی ضیا سے منور کر رہا تھا، اور اس کی رگ رگ سے اس کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

بنور آٹھویں دن اپنے گاؤں پہنچ گیا، لڑکوں نے دوڑ کر، اچھل کود کر، ناچ کر اس کے ہاتھ سے اس کی لکڑی چھین کر اس کا خیر مقدم کیا۔

ایک لڑکے نے کہا کاکی تو مر گئی بنور دادا۔

بنور کے پاؤں جیسے بندھ گئے، منہ کے دونوں کونے نیچے جھک گئے، اور آنکھیں بجھ گئیں کچھ بولا نہیں، کسی سے کچھ پوچھا بھی نہیں، پل بھر جیسے غشی کی حالت میں کھڑا رہا، پھر دیوانہ وار ایک بے خودی کے عالم میں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا، لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے، مگر وہ ان طفلانہ شرارت غائب ہو گئی تھی، نادانستہ طور پر وہ سب بھی اس حادثۂ غم سے متاثر تھے۔

جھونپڑی کھلی پڑی تھی، بڑھیا کی چارپائی جوں کی توں بچھی ہوئی تھی، ایک گوشہ میں دو چار مٹی کے برتن پڑے ہوئے تھے، لڑکے باہر ہی کھڑے رہ گئے، اندر کیسے جائیں وہاں بڑھیا بیٹھی ہے گاؤں میں ہلچل مچ گئی، بنور دادا آگئے، جھونپڑی کے دروازہ پر بھیڑ لگ گئی، سوالات کی یورش ہونے لگی، تم اتنے دن کہاں تھے دادا، تمہارے جانے کے تیسرے دن کاکی چل بسی، رات دن تمہیں گالیاں دیتی تھی، مرتے دم تک تمہیں کوستی رہی، تیسرے دن ہم لوگوں نے دیکھا تو اکڑی پڑی تھی، تم اتنے دن کہاں رہے، وہ مکار بابا پھر نہیں دکھائی دیا، نہیں تو کھود کر گاڑ دیتے۔

بنور نے جواب نہ دیا، صرف مایوس، دردناک، مجروح، خالی آنکھوں سے

ایک بار بھی بلاوا نہ آیا، نہ شوہر ہی نے آنے کی تکلیف کی نازنین کسی طرح اپنے شوہر کو اپنے بس میں کرلینا چاہتی تھی، مہاتماؤں کے لئے کسی کا دل کسی کی طرف سے پھیر دینا کیا مشکل ہے، ہاں ان کی نظر کرم چاہیئے
ایک دن اس نے تخلیہ میں باباجی سے اپنی داستان غم سنائی، بینور کو جس شکار کی تلاش تھی وہ آج بہت دنوں کے بعد پھنستا ہوا معلوم ہوا، تقدس کی شان سے بولا، میں نہ مہاتما ہوں نہ کامل، نہ دنیا کے مایا جال میں پڑتا ہوں۔ لیکن تیری سردھا اور پریم دیکھ کر تجھ پر رحم آتا ہے، بھگوان نے چاہا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی۔
اس انکسار نے اس کا رنگ اور بھی جما دیا، لڑکی نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کی آپ سب کچھ کر سکتے ہیں مہاراج، مجھے آپ کے اوپر پورا وشواش ہے۔
"بھگوان جی کی جو مرضی ہوگی وہ ہوگا، میں کچھ نہیں، ں۔"
"اس بدنصیب کا ڈونگا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں۔"
"ایشور پر بھروسا رکھو۔"
"میرے ایشور تو آپ ہی ہیں۔"
بینور نے گویا اس کی منتوں سے بہت مجبور ہو کر کہا، لیکن بیٹی اس کام میں بہت سے انوشٹھان (عملیات) کرنے پڑیں گے، اور انوشٹھان میں سیکڑوں، ہزاروں کا خرچ ہے، اس پر بھی تیری مراد پوری ہوگی یا نہیں، کہہ نہیں سکتا، ہاں میرے کئے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ میں کروں گا، مگر سب کچھ بھگوان کے ہاتھ ہے، میں مایا کو ہاتھ سے نہیں چھوتا لیکن تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔
اسی رات کو اس غرض کی، باؤلی نے اپنے گہنوں کی پٹاری باباجی کے قدموں پر رکھ دی باباجی نے متنفر ہاتھوں سے پٹاری کھولی، اور چاند کی روشنی میں زیوروں کو دیکھا، ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اب اگر ان میں کچھ عقل ہو تو یہ ساری مایا ان کی ہے، وہ گویا ان کے سامنے دست بستہ کہہ رہی ہے، مجھے قبول کیجئے، کرنا ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں محض پٹاری

"ننا ملے تو کچا ہی کھا جائیں"
تین مہینے گذر گئے

جھانسی ضلع میں دھسان ندی کے کنارے ایک ننھا گاؤں ہے، کاشی پور، ندی کے دوسرے کنارے ایک پہاڑی ہے، اسی پہاڑی کی طرف سے ایک سادھو نے آسن جمایا ہے، لمبے قد کا آدمی ہے، کالے توے کا سا رنگ، جسم گٹھا ہوا، یہ سور ہے جو سادھو کے بھیس میں دنیا کو دھوکا دے رہا ہے، ندی کی بہتا ہوا صاف دل، اب لوٹ سور جیسے کہیں پرائے مال کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی جو پسینے کی روٹی کما کر مگن تھا، جو کبھی اپنے لئے نہیں، ہمیشہ دوسروں کے لئے مرا، گھر کی اور گاؤں کی اور دنیا کی مار اس کے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں اتری، اس زندگی میں کیا پھر کوئی دن آئے گا کہ وہ اپنے گھر پہنچے گا، اور پھر اس دنیا میں بسا کھلا اپنی چھوٹی چھوٹی فکروں اور چھوٹی چھوٹی امیدوں کے ساتھ زندگی بسر کرے گا، کسی پر عاشق تھی وہ زندگی، جتنے بیسے اپنے لئے کسی غریب کرتے تھے، ہمدردی کرتے تھے، دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب وہ تھوڑا سا اناج اور تھوڑے سے پیسے لے کر گھر آتا تھا تو بدھیا اس سے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی اور ساری تھکن، ساری محنت کا وشٹ جیسے اس میٹھاس میں بھیگ کر اور بھی میٹھی ہو جاتی تھی، آہ! وہ دن پھر کب آئیں گے؟ نہ جانے بدھیا کیسے رہتی ہوگی، کون اسے پان کی طرح پھیرتا ہوگا، کون اسے پکا کر کھلاتا ہوگا، گھر میں ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑا، گہنے تک ڈنڈا دیئے، اب اسے اس تماشے کا اسا نقصد آنا کہ پا جائے تو جون ہی پی لے ہائے رے لاہم

اس کے ساتھ عید بسنت میں ایک جلسہ بھی تھی، جسے اس کے شوہر نے کئی سال سے چھوڑ رکھا تھا، جلسہ کا باپ تو مگی بستر تھا، ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے لڑکی کی شادی کی لیکن لڑکا اپنی ماں کا سعادت مند فرزند تھا اور جلسہ اپنی ساس کو خوش نہ رکھ سکی، وہ چاہتی تھی ساس سے علیحدہ ہو کر شوہر کے ساتھ رہے، شوہر اپنی ماں سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا، ماں کی تربیت لا کو کیسے بھولا جائے، وہ روٹھ کر میکے چلی آئی، تب سے تین سال ہو گئے تھے اور سسرال سے

بیٹھ گیا، بھگت لوگ آنے لگے، ارے بابا کہاں گئے، کہیں بھی غائب، یہ ماجرا کیا ہے؟
ایک صاحب بولے رمتے سادھوؤں کا کیا ٹھکانا، آج یہاں، کل وہاں، ایک جگہ رہیں تو مایا جال میں نہ پھنس جائیں، لوگوں سے میل محبت ہو جائے۔
دوسرے بھگت نے کہا، پہنچے ہوئے تھے۔
"پورے سدھو"
"کوئی پوچھو نہیں گیا تھا"
"ینور کہاں ہے، اس پر بڑی دیا کرتے تھے، اس سے کہہ گئے ہوں گے"
ینور دفعتہً لاپتہ ہو گیا تھا، اس کی تلاش ہونے لگی، اتنے میں بدھیا ینور کو پکارتی ہوئی گھر میں سے نکلی، پھر ہنگامہ برپا ہو گیا، بدھیا رو رہی تھی۔ اور ینور کو گالیاں دیتی تھی۔
ینور کھیتوں کی میڈوں سے بے تحاشا بھاگتا چلا جاتا تھا، گویا اس دائرے سے نکل جائے گا۔ ادھر ینور کی بدنیتی کے قصے کھلنے لگے۔
"کل ہم سے پانچ روپے لئے تھے، آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا"
"ہم سے بھی دو روپے آج ہی کے وعدہ پر لئے تھے"
بدھیا روئی، ڈاڑھی جار، میرے سارے گہنے لے گیا، پچیس روپے جوڑ کر رکھے تھے، وہ بھی اٹھا لے گیا۔
ایک آدمی نے اس کو ملامت کی، کیوں اسے گالی دیتی ہے بدھیا، تیرے لئے جان دیتا تھا اور آج تو اسے گالیاں دے رہی ہے، اس کی نیت کبھی بدل ہی نہیں سکتی، اس بابا نے اسے چکمہ دیا ہوگا، بچارہ سیدھا آدمی تھا۔ جھانسے میں آ گیا۔ بڑا مکار نکلا یہ بابا۔
قرائن اس شبہ کی تصدیق کر رہے تھے۔
"ینور لاج کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہوگا"
"مجھو گنگا میں نہ کود پڑا ہو"

ینور کا ضمیر جیسے نور عرفان سے منور ہو گیا، میں اتنا مغرور ہوں، اتنا خود داغ، اتنا کریہ باطن، مزدوری کرتے کرتے جان نکلتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، میں ہی بڑھیا کا سب کچھ ہوں۔ ایشور جو سارے سنسار کا پالن کرتے ہیں تو ان کی مرضی میں دخل دینے والا کون ہے، اس کے زور اعتقاد و صفائی باطن سے ایک صدا سی نکل کر اس کی رگ رگ میں گونجنے لگی، تو گیانی ہے، صرف اتنا بولا، آپ مجھے گیان دیجئے، اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

باباجی نے حکیمانہ انداز سے کہا، دیکھنا چاہتا ہے ایشور کی لیلا، وہ چاہے تو تجھے چھن بھر میں لکھ پتی کر دے، چھن بھر میں تیری ساری چنتائیں ہٹا دے، میں اس کا ادنیٰ غلام ہوں، کوّے کی بیٹ، لیکن مجھ میں بھی اتنی کرامات ہے کہ تجھے پارس بنا دوں، تو صاف دل، سچا، ایماندار آدمی ہے، مجھے تجھ پر دیا آتی ہے، میں نے اس گاؤں میں ایک ایک کو غور سے دیکھا، کسی میں بھی اعتقاد نہیں، ایمان نہیں، تجھ میں میں نے بھگت کا دل پایا، بتا تیرے پاس کچھ چاندی ہے؟

ینور کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ساتھ جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"دس پانچ روپے پڑے ہوں گے، مہاراج۔"

"چاندی کے ٹوٹے پھوٹے گہنے نہیں ہیں؟"

"گھر والی کے کچھ گہنے بھی ہیں۔"

"کل رات کو جتنی چاندی مل سکے یہاں لا۔ اور ایشور کی کرامات دیکھ، تیرے سامنے میں چاندی کو ایک ہانڈی میں رکھ کے بند کر کے اسی دھونی میں رکھ دوں گا، سویرے آکر ہانڈی نکال لینا، مگر اتنا یاد رکھنا کہ ان اشرفیوں کو شراب، جوا یا کسی دوسرے برے کام میں خرچ کیا تو کوڑھی ہو جائے گا، اب جا سو رہ، ہاں اتنا اور سن لے، اس کا چرچا کسی سے مت کرنا گھر والی سے بھی نہیں۔"

"نہیں!"

ینور گھر چلا تو ایسا خوش تھا، گویا ایشور کا ہاتھ اس کے سر پر۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی، سویرے

چاہیں

اسی دن اتفاق سے ایک مہاتما کہیں سے گھومتے گھامتے نکلے اور بابا جی کی جھونپڑی کے سامنے پیپل کے نیچے اس کی دھونی جل گئی گاؤں والوں نے سمجھا ہے نصیب بابا جی کی عزت اور کرم کے سامان جمع ہونے لگے، کہیں سے لکڑی آگئی، کہیں سے پوال کہیں سے بچھانے کو کمبل۔ دھرم داس غریب کے پاس کیا تھا، بابا جی کا بھوجن پکانے کی عزت اس نے اپنے ذمہ لی۔ جس میں آگئی بابا جی نے دم لگانا شروع کیا سگتوں کی ایک جماعت نے بھی گانے کی تیاریں کیں اور ڈھول مجیرا کرتال آگئے

دو ہی دن میں ہی بابا جی کے کشف و کرامات کے چرچے ہونے لگے، وہ دو دو پہر میں ان کی نگاہ پر سادھو کی ہمدردی نہیں، تو بھو تو بھوں ہی نہیں گیا پیسا ہاتھ سے نہیں چھوتے، اور بھوجن بھی کیا کرتے ہیں، آٹھ پہر میں ایک کٹورا دودھ پی لیا، بابا کی روکھی کھیچڑی کھالی لیکن چہرہ پر کیسا ملال ہے، جیسے شمع جل رہی ہو، ساں کسی منی ہے دھرم داس اور بابا جی کا خاص طور پر معتقد ہوگیا تھا اس پر کہیں بابا جی کی دیا ہوگئی تو پارس ہی ہو جائے گا سارا دکھ دلدّر دور ہو جائے گا

آدھی رات ہوگئی تھی دھرم داس کی حالت رحمت ہوگئی تھی صرف دھرم داس بیٹھا بابا جی کے پاؤں دبا رہا تھا

بابا جی نے فرمایا، بچہ سنسار مایا ہے، اس میں کیوں پھنسے ہو

دھرم داس نے سر جھکا کر کہا، نادان ہوں مہاراج، کیا کروں، عورت ہے اسے کس پر چھوڑوں؟

"تو سمجھتا ہے تو ہی اس کا پالن کرتا ہے"

"اور دوسرا کون سہارا ہے اسے بابا جی"

"ایشور کچھ نہیں ہے، تو ہی سب کچھ ہے"

آلو چولھے میں ڈال دیئے تھے، اُن کا بھرتا بنایا، تب، دونوں ساتھ کھانے بیٹھے۔

بڈھیا نے حسرت سے کہا، میری جان سے تمہیں کوئی آرام نہ ملا، پڑے پڑے کھاتی ہوں اور تمہاری چھاتی پر مونگ دلتی ہوں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ بھگوان مجھے اٹھا لیتے۔

"بھگوان آئیں گے تو میں کہوں گا، پہلے مجھے لے چلو، تب اس سونی جھونپڑی میں کون رہے گا؟"

"تم نہ رہو گے تو میری کون دسا ہوگی، یہ سوچ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، میں نے کوئی بڑا پُن کیا تھا کہ تمہیں پایا، کسی اور کے ساتھ میرا کیا نباہ ہوتا۔

اس انکسار میں کتنا نشہ تھا، بیور کی ایک ایک رگ مخمور ہو اٹھی، اس کے پہلے بھی کتنی ہی بار یہ مسئلہ چھڑا تھا اور یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں بیور نے اپنے حق میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے میں جاؤں گا۔

اُس کے بعد بھی بدھیا جب تک جئے آرام سے رہے، کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاوے اسی لئے وہ مرتا رہتا تھا کہ ہاتھ میں چار پیسے ہو جائیں، سخت سے سخت کام جس کے لئے کوئی نہ کھڑا ہو وہ بیور کے ہاتھوں انجام پاتے، دن بھر پھاوڑے، کدال کا کام کرنے کے بعد رات کو وہ اوکھ کے دنوں میں کسی کی اکھ بیلتا، یا فصل کی رکھوالی کرتا، لیکن دن نکلتے جاتے تھے اور جو کچھ کماتا تھا وہ بھی نکلتا جاتا تھا، بدھیا کے لئے کوئی آسرا نہ تھا۔

لیکن آج کی باتوں نے بیور کے دل میں ہیبت ڈال دی سچ مچ کہیں بڑھاپے ہی میں چلی جاوے، پانی میں ایک بوند رنگ کی طرح یہ خیال اس کے دل میں سما کر پھیلنے لگا۔

گاؤں میں بیور کیلئے کام کی کمی نہ تھی، پر مزدوری تو وہی ملتی تھی، جو اب تک ملتی آئی تھی اس کساد بازاری کے زمانہ میں وہ مزدوری بھی نہ رہ گئی تھی، کہیں بدھیا پہلے چل بسی تو اس کے کریا کرم کے لئے تو ہاتھ میں ہونا چاہیئے، اس دھوم سے کام کرے گا کہ لوگ دنگ رہ

سر جھکا کر پنڈت جی سے، مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا، اسی دن رات کے لیے تو آدمی ساری سال مرتا
ہے، ہمیں کسی بڑے محل کے سوا اور کیا رکھا ہے، یہاں سے جا کر روٹی پکاؤں گا، پانی لاؤں گا
تب بڑی مشکل سے دو کور کھائے گی، بس مجھے اپنی کا چھا سکی، تمہاری طرح چار پھنکی مار کر
ایک لوٹا پانی چڑھا لیا صاحب سے مشار گتی جاتے ہے تو وہ اور بھی ٹوٹ گئی، بڑا بھاری جھٹکا
لگا، اس کو ماں کی مامتا، ہم تم کیا سمجھیں گے بیٹا، پہلے تو میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا، اب
تو اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے

دیکھنے تو گھاس ترکل روکھ پر کاٹنے کو جڑ رہے تھے، ابھی تو گورا سین کی
سوز کے چہرہ پر درد جھلک اٹھی، بولا ابھی بکری کے لیے گھاس تو ڑ رہا تھا منا
اس کا دودھ تو پیتی تھی، اب بکاری بڈھا ہو گئی ہے، دودھ کیا دے گی، لیکن کیسے بھول
جاؤں کہ بیٹا اسی کا دودھ پیتی تھی

گھر پہنچ کر سوز نے لوٹا اور ڈول اٹھایا، اور نہانے چلا کہ بیوی نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے
کہا، ابھی ورکسوں کر رہے ہو، آدمی کام کے پیچھے جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے، مجبوری
سے کوڑا بیجی سے تو کام بھی برابر کر، کوئی ایک دھیلا بھی تو نہیں دے دیتا

سوز کے جھلسے دل پر سہرے بادلوں کی طرح ایک مسافر کی شیطان داری ہوگئی، اس
لفظوں کی مٹھاس نے جیسے اس کے دھوئے ایک ایک حصے کو مٹھاس میں سرابور کر دیا، اس
نے عورت محبت میں کیا ہوا، کسی دکھائی کہ مرا اندیشی بھری ہوئی تھی اور دوسرا کون
ہے جسے اس کے آرام کی، اس کے مرنے جینے کی فکر ہو، پھر وہ کیوں نہ اپنی زندگی کے لیے مرے
سرد میں آکر بولا، تو اس ملم میں کوئی دیوی رہی ہوگی بڑھیا، ٹیچ، بڑھاپے میں
جھڑکی دی، اکھاڑ سے دور چاپلوسی ہمارے آگے اب کون تھا، اچھے جس کے
لیے ای ہائے ہائے کرتے ہو۔

سو گھر پھر کی بھاں لئے نہانے چلا گیا لوٹ کر اس نے موٹی موٹی روٹیاں پکا س

نیور اپنے کام میں مصروف تھا، نوجوانوں کی گلخپ میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، دینا نے اسے باتوں میں لگانے کی دوبارہ کوشش کی، تو یہاں سے جاکر روٹی پکاؤ گے، دادا تمہاری بڑھیا کیوں کام نہیں کرتی، ہم سے تو دادا ایسی مہرپا سے ایک دن نہ بیٹھے۔

یہ کوشش کارگر ہوئی، نیور کے پچکے ہوئے کھچڑی موچھوں سے ڈھکے چہرہ پر تبسم کی نورانی لکیر کھنچ گئی، جس نے اس کے کریہہ منظر میں بھی ایک حسن پیدا کر دیا، بولا جوانی تو اسی کے ساتھ کٹی ہے بیٹا، اب اس سے کوئی کام نہیں ہوتا تو کیا کروں۔

گوبر نے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے، نہیں کام کیوں نہ کرتی، مجھے سے کھاٹ پر بیٹھی چلم پیا کرتی ہے، اور سارے گاؤں سے لڑا کرتی ہے، تم بوڑھے ہو گئے، لیکن وہ تو اب بھی جوان بنی ہوئی ہے۔

دینا نے اور رقا جمایا، جوان عورت کیا اس کی برابری کرے گی، سیندور، کاجل، مستی مہندی، ان سنگاروں میں تو جیسے اس کا من بستا ہے، جب دیکھا کنارہ دار رنگین ساڑی پہنے دیکھا، اس پر گہنے الگ، گہنوں سے تو اس کا جی ہی نہیں بھرتا۔ تم گئو ہو، اس سے نباہ ہو جاتا ہے، نہیں اب تک گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

گوبر نے تھوڑے دن پہلے اپنی عورت کو اسی لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کام چور تھی، اور کھانے میں حاتم۔

دینا بولا، مجھے تو اس کے بناؤ سنگار پر غصہ آتا ہے، کچھ کام نہ کرے گی، کھانے پہننے کو اچھا ہی چاہیے۔

نیور نے جیسے اپنی صفائی دی، تم کیا جانو گے بیٹا، تب تم لوگوں کا جنم ہی نہیں تھا جب وہ آئی تھی۔ تو میرے گھر میں سات ہل چلتے تھے، وہ رانی بنی بیٹھی رہتی تھی، تھی بھی بڑے گھر کی بیٹی، مجور لگے ہوئے تھے، اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جمانا بدل گیا تو کیا، اس کا دل تو وہی ہے، گھڑی بھر چولہے کے سامنے بیٹھ جاتی ہے تو آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ اور

ٹیلیفون کی گھنٹی دوبارہ بجی، سب کے سب دوڑے، ریسیور بکرم کے ہاتھ لگا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں بکرم؟"

"کیا خوش خبری ہے؟"

"اس شہر کا صفایا ہے، شہر ہی کا نہیں، سارے ہندوستان کا، امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے؟"

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے، بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو بے حس و حرکت نقش دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے، چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں، مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں، اور کہہ رہی تھیں، سبھوں نے بے ایمانی کی، کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا، بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصہ اتارا، اور انہیں برخاست کر دیا، اسی لئے تمہیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے، حرام کا مال کھاتے ہو اور بھجن کرتے ہو۔

اتنے میں بکرم رونی صورت لئے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا، اب تو معاملہ ختم ہو گیا، مگر سچ کہنا۔ تمہاری نیت فاسد تھی یا نہیں؟

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

"اب کیا کروگے پوچھ کر، پردہ ڈھکا رہنے دو۔"

آپ زور سے کہتے ہیں، ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولے سا لگتا ہے، دیو سا تو قد ہے اور ستہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں شیروں کو ایک گھونسے میں مار ڈالتے ہیں، اُف سر پھٹا جاتا ہے، اُن کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا، ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں، اور یہ نہیں کہ ایک دو پتھر مار کر رہ جائیں، جب تک آپ دوڑنے جائیں گے مارتے جائیں گے، جب تک آپ گر نہ پڑیں، مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد سے قریب پہنچیں گے، ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لئے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے، آدھا یا اس سے بھی کم، میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں، لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے، جھکڑ بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(۴)

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی، سویرے ہی سے ڈاکخانہ کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا، تار کا انتظار ہونے لگا، دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں بیٹھ کر پوجا کرنے لگے، ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا، بکرم تو ڈاکخانہ گیا، میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا، دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے، اُن کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا، بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں، کیوں پجاری جی؟

پجاری جی نے فرمایا، ہاں سرکار! گج[1] کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لئے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے،

[1] روایت ہے کہ ایک بار ایک ہاتھی دریا ندی میں پانی پینے گیا، ندی میں ایک نکر تھا، اس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑ لی، ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام چھیر ساگر (دودھ کے سمندر) سے ہاتھی کی مدد کو دوڑے۔

ادھوں کی صورت سے بھاگے ہیں اور پتھر لے کر مارنے دوڑے ہیں، جو ڈر کر بھاگا وہ نامراد
جانئے جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے بس
یہی سمجھئے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے، آگے میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا کوئی مٹھائی
لے، کوئی پھولوں کی مالا کوئی شال اوڑھا دے، جھکڑ بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے یکایک
انہوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے، بھیڑ میں
بھگدڑ مچ گئی، لوگ گرتے پڑتے بھاگے، لیکن میں وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا، انہوں
نے پتھر چلانا ہی شروع کر دیا، پہلا پتھر سر میں لگا کھوپڑی پھٹ گئی، معلوم ہوا جیسے کوئی آگ لگ گئی ہو،
آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا بس وہیں
ڈھیر ہو گیا، بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے ادھر گھنٹہ بھر تک تو مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا، آخر
بہت مشکل سے اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، انہوں نے کہا فریکچر ہو گیا ہے، پٹی باندھ دی
بڑی تکلیف کا سامنا ہے، مگر مراد پوری ہو گئی، اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے، اطلس شنیل
سب سے پہلے جھکڑ بابا کی کٹیا سجا دوں گا ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد
نہیں لوٹا

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا الٰہی جی کا احسان ہے سر پھٹا تو
کیا ہوا بازو بھی ٹوٹا کیا غم ہے، لاٹری تو اپنی ہو گئی۔
شام ہو گئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے، بھگوان سے کاروبار کی
چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے، ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، پوچھا بابا
تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے سمجھ میں
پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا جی ہاں
کیوں بہت زور سے مارتے ہیں؟
پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا

"یہ وکالت نکل جائے گی، جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی"

"اچھا زبان سنبھالئے، میں نصف لوں گا، اسی طرح جیسے گھر کی جائداد میں میرا نصف ہے"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے آکر کھڑے ہو گئے، بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا یہ تمہیں کیا ہو گیا، ارے، یہ چوٹ کیسی، کسی سے جھگڑا ہو گیا، یا گر گرا پڑے، ارے بھگو! جا ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا لا۔

اماں جی نے پرکاش کو ایک آرام کرسی پر لٹا دیا تھا، اور دو فوراً اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرتناک لہجہ میں کہا، کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔

بڑے ٹھاکر صاحب نے جو غم و غصہ سے کانپ رہے تھے، کہا، کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے، کہتے ہو چوٹ نہیں لگی کس سے جھگڑا ہوا، کیا معاملہ ہے بتلاتے کیوں نہیں، میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔

"آپ ناحق گھبراتے ہیں، بہت معمولی چوٹ ہے، دو چار روز میں اچھی ہو جائیگی"

اس کے چہرہ پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی، ندامت، غصہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا، بھگوان کریں، جلد اچھے ہو جاؤ لیکن چوٹ لگی کیسے کیا کسی تانگہ سے گر پڑے۔

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا، کچھ نہیں، نہ کسی تانگہ سے گرا، نہ کسی سے جھگڑا ہوا، ذرا جھکڑ بابا کے پاس چلا گیا تھا، یہ انہیں کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، وہ

سوچ لو، اور کیا کرو گے؟ مگر نہیں، شاید اس مدعا کے کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی، گویا مجھ
تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی اور تشہیر کے خوف سے۔

ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ کایک کریم نے کہا، ہمارا ٹکٹ نکل
آئے تو مجھے دل میں بڑا افسوس ضرور ہوگا کہ ناں تم سے ساجھا کیا

میں نے چونک کر کہا، اچھا مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا؟

لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے

اس سے کیا ہوتا ہے؟

”اچھا مان لو، میں کہہ دوں، تم نے ٹکٹ میں ساجھا نہیں کیا

میرے خون کی حرکت بند ہو گئی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا

”میں تمہیں اتنا بد دیانت نہیں سمجھتا“

”مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ، سوچو“

”تو آؤ لکھا پڑھی کر لیں، جھگڑا ہی کیوں رہے

کریم نے ہنس کر کہا، تم بڑے شکی ہو یار، میں تمہارا امتحان لے رہا تھا بھلا ایسا کہیں
ہو سکتا ہے، پانچ لاکھ نہیں، پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایمان جائے گا تو سب میں سودہ
آنے دوں گا

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی، دل میں ایک شورش آگ کی چنگاری
کی طرح سلگنے لگی، کہیں یہ شخص سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں

میں نے کہا، یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آ سکتا، لیکن تحریر کے
پابند ہو جانے میں کیا ہرج ہے؟

”فضول ہے“

”فضول ہی سہی“

ایسے نہ ہوں تنخواہ تو بند تھی، ہاں مگر تیرات زیادہ کرتی تھیں، اب برت بھی رہ رہ کر رکھتی تھیں وظائف تو بھی اصل بھر پڑھا تھا، نیک ماتی کہتے ہیں کہ خدا پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا، میں دیکھتا تھا، ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دینداری ہے، وہ ہماری روح پرستی کے طفیل ہے، ہماری ادنیٰ سب ہماری دنیا کے ہل پر لنگا ہوا ہے، بھوکا انسان ... اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے، ایسے ہیرے لے لینا تجربہ تھا، ورنہ میں روحانیت کا قائل نہ تھا۔ اس مصیبت میں بھی روحی تسکین دی لیتے، ورنہ انجام کو گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں ساتھ والے، ہمارے پاس روپیہ نہ تھے، نہ اتنا وقت تھا، مجھے نوکری کہاں ملتی، بکرم کو کالج جانا تھا، ہم دونوں ہاتھ مل کر رہ جاتے، دل جوئیوں کی تلاش میں رہتے تھے، مگر اس کے لئے بھی ہمارے پاس خوشامد اور خدمت گذاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قسمت کی رات قریب آتی جاتی تھی، ہمارا سکون خاطر غائب ہوتا جاتا تھا، ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا، میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کر دے تو کیا کرلوں، صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی تحریر ہے، نہ کوئی دوسرا ثبوت، سارا دارومدار بکرم کی نیت پر ہے، اس کی نیت میں ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام، کہیں فریاد نہیں کرسکتا، زبان تک نہیں کھول سکتا اب اگر تحریر کے لئے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں، اگر اس کی نیت بدل گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا۔ اگر نیت درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہوگا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے، لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے، ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں، اس وقت ایماندار بننے میں کچھ حرج نہیں ہوتا، آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسن اتفاق سے میرا نام آجاتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالہ کر دیتا؟ کبھی نہیں، تم نے مجھے ڈھائی روپے قرض دیئے تھے، اس کے بدلے پانچ لے لو، دس لے لو

کر لیا اس اشلوک یا کر کیوں چوک گئے

کرم ہوا اچھا بھئی ہم سے ایک بات کہیں کسی سے کہو گی تو نہیں، اگر کہار و ملال ہی
لگا، میں اسکے بیچ تو صحل لگا کر پڑھاوں گا اور پاس کرا دوں گا، ہم دونوں نے بھی یارٹی
لٹ لیا ہے، ہم لوگوں کے بھی افسوس ہے دعا کرو اگر دو سے لو مجھے جواہرات سے
دیں گے ہم، اگر میرا کسی سے کہا ہے، مگر کسی کا نام ایسا معلوم نہ تھا، یہاں سے
مدہ کر کے کسی اگر اند جانے ہی بھائی اچھوڑ دیا، ایک ہی کو ہیں سارے گھر میں خبر پھیل گئی
سے دیکھے ہم دونوں کو کھمیں دکھا دیا ہے، پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دے، مگر
لکٹ لو تم ہی پاکیوں کی کیا ضرورت ہے نہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے، ر کسی سے اچھا
چھا، لیکے روپے پھینک دے جو روما صحب والی کتاب ساتھ آئی، گھر کے رنگ چاہے
میرا آگ لگا دیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کتابے چھوٹے ان کی رسی کے علاوہ آدمی بھی
کھمہ تو کہاں بیچ جاتا ہے

(۳)

کرم کے والد بڑے ٹھاکر کہلاتے تھے، چچا چھوٹے ٹھاکر، دونوں ہی ملحد تھے، پکے
نک، دیوتاؤں کے دشمن پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے گنگا کو پانی کی دھارا اور سوریہ
سرکے مقامات کہنے والے، مگر آجکل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے، بڑے ٹھاکر صاحب تو رے
الصبح گئے پاؤں گنگا اسنان کر کے آتے اور دوپہر تک شہر کے دیوالیوں کی پوجا کرتے
سے کوئی گیا ۔ کے گھر لوٹتے تھے، چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوتے وہ ایک لاکھ رام
رام لکھ کر جب مل پاس کرتے، دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور
ناہ بیچے رات تک بھاگوت کی کتھا سنا کرتے، کرم کے بڑے بھائی صاحب کا نام بھارگو تھا
انہیں سائنس و مسئلوں سے عقیدت ہو گئی تھی، انہیں کا مذہب میں دور دور رہتے، انہیں
یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما اثر ہو دیا او ن کا نام آیا، بس پھر ہم کا الٹی چال اٹھا میں

نا ہی عدم ہوں اور وہ گل جھڑے اڑائیں، نہ نہ میں اس وبال ---

بکرم کی بہن کنتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے، کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی، مگر بڑی خوش مزاج، اور انتہا درجہ شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا تو بڑی شیطان ہے کنتی، میں تو ڈر گیا، کس نے تجھے بلایا یہاں؟

کنتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا، جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو، اور بولی تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو۔ جب دیکھو یہیں جمے ہو۔ نہ کوئی کام نہ دھندا، کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے، ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے، تم چلے ہی نہیں، آخر میں کس کے ساتھ جاؤں، کیا کوئی جادو منتر جگا رہے ہو؟۔

بکرم ہنسا، ہاں جادو جگا رہے ہیں۔ جس میں تجھے ایسا دولہا ملے، جو گن گن کر دو نہ پاپڑ ہضم جائے۔

کنتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور بولی مجھے ابھا بیاہ ہی نہیں کرنا ہے، اماں سے پچاس ہزار روپیے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی، کیوں کسی مرد کی غلامی کروں، کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسی جتائے گا گویا اس کی زرخرید لونڈی ہوں، بندی باز آئی ایسی شادی سے، میں روز اماں کے ٹکٹ کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دعائیں بڑی تاثیر ہوتی ہے، میرا تو دل کہتا ہے، اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔

مجھے اپنی ننھیال کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی بھادوں کا مہینہ آگیا اور پانی کی ایک بوند نہیں، تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی، اور دوسرے دن موسلا دھار بارش ہوئی تھی ضرور کنواریوں کی دعائیں تاثیر ہوتی ہے۔

میں نے بکرم کو پر معنی نظروں سے دیکھا۔ بکرم نے مجھے نظروں ہی نظروں میں ہم نے

میں مجبور ہوگیا، کرم کے نام سے ٹکٹ لا گیا

(۱)

ایک ایک کرکے اسٹیشن کے دن کٹتے گئے، صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی میرا مکان کرم کے مکان سے ملا ہوا تھا سکول جانے کے وقت اور سکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھتے اپنے منصوبے باندھا کرتے، اور سرگوشیوں میں، کہ کوئی سن نہ لے، ایک دن شادی کا ذکر چھڑ گیا

کرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا، حقیقی میں شادی وادی کا قطعاً قائل نہیں بالعاجلہا حوا مخواہ کی کرف اور پرستانی رسیوں کی با رواداری ہی میں سب سے بے لذت جائیں گے ہم لوگ نسل کے کوئی ٹھیکہ دار میں

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پہ غور کیا اور تو درست ہے اگرچہ تمک شادی وغیرہ میں کوئی رنجیں نہ ہو، دولت کا لطف ہی کیا، محاہوری سے انسان کی طبعیت جو نعرت کرتی ہے، میں تو بھی عیالداری سے اسا مرا نہیں، اس میں انسا چاہتا ہوں جو کسے معنوں میں ندیم ہو، اور وہ ہوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے کرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے بولا ضرور بالضرور، آپ کو عیالداری مبارک سدا لوآزار رہے گا اسے پرے سے جہاں چاہا اڑ گئے، اور جب جی چاہا سو گئے نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے، ذرا سی دیر ہوئی اور فورا جواب طلب، آپ کہیں چلے اور فورا سوال ہوا، کہاں جاتے ہو، کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو

میں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں اور نہ چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی یہ سوال کرے، تاہم آپ کو شادی مبارک، بچے کو خدا سارکا ہوا اور آپ اٹھے چلے جارہے میں سوسو جھک ڈاکٹر کے پاس، اور اگر کسی او لونڈے میں بات ملی کرکے آپ

بکرم مستقل تھا، ہرگز نہیں، کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہوگا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کروگے
میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا، بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔
تمہارے گھر میں کافی جائداد موجود ہے، والدین بھی زندہ ہیں، کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں
میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے، دو بہنوں کی شادیاں ہیں، دو بھائیوں کی تعلیم
ہے، نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا، میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود
سے نکل آئیں، اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے، کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا کہ میرے بعد
کوئی اصل کو نہ نکال سکے۔

"تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے، لیکن بینکوں کا شرح سود بہت گرا ہوا ہے۔"
پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں، اگر پانچ فی صدی بھی ملے ۲۵ ہزار سالانہ ہوئے
تھوڑے ہیں؟"

ہم نے کئی بینکوں کا شرح سود دیکھا، واقعی بہت کم تھا، خیال آیا کیوں نہ
لین دین کا کاروبار شروع کر دیا جائے، بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو، لین دین میں
سود بھی اچھا ملے گا اور رعب داب بھی رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے، ہاں جب
تک اچھی جائداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے، چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو مجبوری
معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے، جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے
میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا، روپے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل ہی جاتی ہے۔
مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے، کس کا نام دیا جائے۔
بکرم نے کہا۔ میرا نام رہے گا۔
"کیوں میرا کیوں نہ رہے؟"
تمہارا ہی نام سہی، لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی، اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں
پر رعب جماؤں گا اور لوگوں کو خوب جلاؤں گا، بالکل طفلانہ خواہش ہے۔"

آٹھ ٹکٹ خریدنے جا سکتا تھا، بڑے بھائی کے نام تو دس لاکھ بھی ہوتے تو ہاں اماں کے
بھائے تو ہنسنے لگیں ہیں مگر اس سے کہیں مالی کیسی ہے معصوے تو اسے اونچے
ہیں لیکن روپے اُن کے پاس ہے، نہ میرے گھر میں، روپے ملنے کی اسے امید رہتی، لیکن
بہا بہت بعد کی تاریخ بھی ہو جائے، مگر وہ اس بار کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا

میرے پاس بھی روپے نہ تھے میں اسکول میں ماسٹر تھا، مجھے روپے ملتے تھے،
وہ گھر بھیج دیتا تھا دس بیس ٹیوشن بھی کیا کرتا تھا، اسی ملک میں باہر روپے کے ٹکٹ
خریدنا میرے لیے مشکل ہی نہیں محال تھا

کرم نے کہا کیوں نہ میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا انگلی سے پھسل پڑی اور
گم گیا، مجھے چوری کا تو راز کھل جائے گا اور سب شرمندگی ہوگی، اس کام کیوں کر ہو کر بعد
کو حقیقت ہو یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پرانی کتابیں کسی سیکنڈ ہینڈ کتابوں
کے دکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خرید لیں ہم دونوں کے پاس
اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک الجبرا جامیٹری، جاگرفی موجود تھیں، میں تو ماسٹر تھا،
کسی بک سیلر کی دکان پر جانے جھینپتا تھا، اور یہ ڈر بھی مجھے بچا سے تھا اس لیے یہ خدمت
کرم کے سپرد ہوئی، وہ آدھ گھنٹہ میں پانچ روپیہ کا ایک نوٹ لیے آپہنچا، کتابیں کچھ سے
کم کی تھیں مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لیے پانچ لاکھ کے برابر تھے، معلوم ہوگیا ہم دونوں
سانجھے میں ایک ٹکٹ لیں گے آدھا میرا ہوگا آدھا کرم کا دس لاکھ میں پانچ لاکھ دوسرے
حصہ میں آئیں گے، پانچ لاکھ کرم کے ہم اپنے اسی میں خوش تھے، ہاں کرم کو اپنی سیاحت
والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنی پڑی، کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی
یہ کرم کی زندگی کا مقصد اولیٰ تھا

میں نے اعتراض کیا، یہ تو کوئی نہیں کہ ہمارا ٹکٹ جا سکتا ہے ہیں سب سے زیادہ شیدا
تو مالک ہوکر بھی کچھ کم نہیں ہوتا

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی، ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد، چچا، بھائی، ماں، سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے، روپے رہیں گے تو گھر میں ہی کسی کے نام سے آجائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی، اس وقت تک زندگی کا مجھے جو تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا وہ تو بہت ہمت افزا نہ تھا، لیکن تقدیر کا حال کون جانے، گاہ باشد کہ کودک ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بے تاب ہو گیا۔ اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بنا چاہتا تھا۔ جس کے نام روپے آئیں گے وہ خود موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے بہت ہوگا، دس پانچ ہزار اس کے حصہ میں آجائیں گے، مگر اس سے کیا ہوگا، اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے، پہلے تو اسے ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی ایک ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آپہنچے، وہ ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا، پیرو، برازیل، مڈغاسکر اور ابی سینیا یہ سبھی دشوار گذار خطے اس کے پروگرام میں تھے، پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تعمیر کرانا تھا، جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں، اس کے لئے وہ دو لاکھ تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے

مس خورشید نے شرارت کی، صورت تو اُن کی لاکھوں میں ایک ہے۔
مسز ٹنڈن نے صاف صاف کہا، نہیں ان کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں
آشرم کو ہم بدنام نہیں کرنا چاہتے۔
مس خورشید نے ضد کی، معاملے کو صاف کرنے کے لئے اُن کا آپ لوگوں کے سامنے
آنا ضروری ہے، یک طرفہ آپ فیصلہ کیوں کرتی ہیں۔
مسز ٹنڈن نے ٹالنے کے لئے کہا، یہاں کوئی مقدمہ تھوڑا ہی پیش ہے۔
مس خورشید۔ واہ میری عزت میں بٹہ لگا جا رہا ہے اور آپ کہتی ہیں کوئی مقدمہ نہیں ہے
مسٹر کنگ آئیں گے اور آپ کو ان کا بیان سننا ہو گا۔
سوائے مسز ٹنڈن کے سب ہی عورتیں کنگ کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں کسی نے
اختلاف نہ کیا۔
خورشید نے دروازہ پر آکر اونچی آواز سے کہا، تم ذرا یہاں چلے آؤ۔
ہنڈ کھلا اور مس لیلا وتی ریشمی ساڑی پہنے مسکراتی ہوئی نکل آئیں۔
آشرم میں سناٹا چھا گیا، عورتیں حیران ہو کر دیوی لیلا وتی کو دیکھنے لگیں۔
جگنو نے آنکھیں چمکا کر کہا، اُنہیں کہاں چھپا دیا آپ نے؟
خورشید۔ وہ چھو منتر سے اڑ گئے، جا کر گاڑی دیکھو۔
جگنو لپک کر گاڑی کے پاس گئی، اور خوب دیکھ بھال کر منہ لٹکائے ہوئے بولی۔
مس خورشید نے پوچھا کیا ہوا، ملا کوئی۔
جگنو۔ میں یہ تریا چرتر کیا جانوں؟ (لیلا وتی کو غور سے دیکھ کر) مردوں کو ساڑی
پہنا کر آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ یہی تو ہیں وہ رات والے صاحب۔
خورشید۔ خوب پہچانتی ہو؟
جگنو۔ ہاں ہاں کیا اندھی ہوں۔

مسز پانڈے نے مداخلت کی، ہم آشرم کو اپنے معیار سے گرانا نہیں چاہتے، میں تو کبھی یوں
ایسی عورت کسی بھی اسکول کی پرنسپل بننے کے قابل نہیں
مسز بانگڑا نے فرمایا، مگو بائی نے ٹھیک کہا تھا، ایسی عورت کا سایہ دیکھنا بھی پاپ
ہے، ہمیں اسے صاف کہہ دینا چاہئے، آپ یہاں تشریف نہ لائیں
ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آشرم کے سامنے ایک موٹر آکر رکی، عورتوں نے سر
اٹھا کر دیکھا تو موٹر میں مس خورشید اور ولیم کنگ بیٹھے ہوئے تھے
مگو نے منہ پھیلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا، یہی لونڈا ہے، عورتوں کا سارا مجمع دریچے
کے سامنے آنے کے لئے بے چین ہو گیا
مس خورشید موٹر سے اتر کر برآمدے میں گئیں اور آشرم کے دروازے کی طرف چلیں،
مستورات بھاگ کر اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھیں،
مس خورشید نے کمرے میں قدم رکھا، کسی نے استقبال نہ کیا، مس خورشید نے مگو کی
طرف بے تکلف آنکھوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا کہئے بائی جی، رات آپ کو چوٹ
تو نہیں آئی؟
مگو نے بہتیری دیدہ دلیر عورتیں دیکھی تھیں، پر اس دیدہ دلیری نے اسے حیران
کر دیا، چور ہاتھ میں چوری کا مال لئے ساہو کو للکار رہا تھا
مگو نے اینٹھ کر کہا، جی میرا ہو تو اب شہزادہ صاحب کی ہوں
خورشید: وہ اسی وقت اپنا قصور معاف کرانے آئے ہیں، رات وہ نشہ میں تھے،
مگو نے مسز ٹنڈن کی طرف دیکھ کر کہا، اب آپ بھی تو کچھ کہئے، میں نہیں کہتی
خورشید نے مذاق سمجھ کر کہا، میں نے آج تک کبھی نہیں پی، مجھ پر جھوٹا الزام مت لگاؤ
مگو نے لاٹھی ماری، شراب سے بھی بڑی نشہ کی چیز ہے کوئی، وہ اسی کا نشہ ہوگا
اس صاحب کو جو تم کیوں ڈھانک دیا، ہم بھی تو ان کی صورت دیکھیں

کے لئے منع تھا ابھی خورشید کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جوتے کا چرچراہٹ سنائی دیا اور ایک منٹ میں لیم کنگ نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کپڑوں سے شراب کی بو آ رہی تھی، وہ آتے ہی مس خورشید سے لپٹ گیا

مس خورشید نے اپنے کو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا چلو ہٹو شراب پی کر آئے ہو

کنگ نے شرابیوں کی طرح کہا آج تمہیں بھی پلا دوں گا

مس خورشید نے اس طرح جگنو کی موجودگی کا اشارہ کیا کہ جگنو کی نظر بچانا چاہتی ہو

کنگ نشہ میں مست تھا جگنو کی طرف دیکھا ہی نہیں

مس خورشید نے غصہ سے اپنے کو الگ کر کے کہا یہ کیا بیہودگی ہے چلو ہٹو!

کنگ۔ اتنے دنوں سے چوروں کی طرح آیا ہوں آج سے میں کھلے خزانے آؤں گا

خورشید۔ تم تو پاگل ہو رہے ہو دیکھتے نہیں ہو کمرہ میں کون بیٹھا ہوا ہے۔

کنگ نے حیران ہو کر جگنو کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا او میری ماں سالک کی تم یہاں کیسے آئی ہندوستانی عورتوں کی جگہ، یہاں مسیحیوں کا راج ہے، ہم تم کو دام کو جاتا ہے، میں سرکار کا گھونٹ دوں گا

جگنو بجلی کی طرح کمرہ سے نکلی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی ادھر کمرہ سے قہقہے اٹھ اٹھ کر کمرہ کی چھت کو ہلانے لگے

جگنو اسی وقت مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی اس کے پیٹ میں ملنے سے اُٹھ رہے تھے مگر مسز ٹنڈن سو گئی تھیں، وہاں سے ناامید ہو کر اس نے کئی دوسرے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹائیں پر کوئی دروازہ نہ کھلا اور غریب کو ساری رات اسی طرح کاٹنی پڑی اسے کوئی ایسا آدمی نہ ملا جو گود میں سو جائے صبح وہ آشرم میں جا کر دی کوئی دو گھنٹے میں مسز ٹنڈن بھی آئیں اور اس کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا

جگنو۔ میں تو ان کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی۔ دھوپ میں بال نہیں سفید کئے ہیں۔

ٹنڈن ۔ کل پھر جانا۔

جگنو۔ کل نہیں، میں آج ہی رات کو جاؤں گی، لیکن رات کو جانے کے لئے کوئی بہانہ ضروری تھا ۔ مسز ٹنڈن نے آشرم کے لئے ایک کتاب منگوا بھیجی۔ رات کے نو بجے جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر جا پہنچی۔ اتفاق سے اس وقت لیلاوتی وہاں موجود تھی، بولی یہ بڑھیا تو بے طرح پیچھے پڑی خورشید۔ میں نے تم سے کہا تھا اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔ تم جا کر روپ بھر آؤ، تب تک میں اسے باتوں میں لگاتی ہوں۔ سنراسیوں کی طرح اول ملول بکنا شروع کر دینا بس یوں بن جانا جیسے اپنے ہوش میں نہیں ہو۔

لیلا مس میں ڈاکٹر تھی۔ اس کا بنگلہ بھی پاس ہی تھا وہ چلی گئی تو مس خورشید نے جگنو کو بلایا۔

جگنو نے ایک پرزہ دے کر کہا، مسز ٹنڈن نے یہ کتاب مانگی ہے، مجھے آنے میں دیر ہو گئی، میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی، پر سویرے ہی وہ مجھ سے مانگے گی، ہزاروں روپیہ مہینے کی آمدنی ہے مس صاحبہ، مگر ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتی ہے۔ ان کے دروازہ پر بھکاری کو بھیک تک نہیں ملتی۔

مس خورشید نے پرزہ دیکھ کر کہا، اس وقت تو یہ کتاب نہیں مل سکتی، صبح لے جانا، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔

وہ پردہ اٹھا کر پیچھے کے کمرہ میں چلی گئی، اور وہاں سے کوئی پندرہ منٹ میں ایک سولہ وقت ریشمی ساڑی پہنے عطر میں بسی ہوئی منہ پر پاوڈر لگائے نکلی۔ جگنو نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اوہو، یہ سنگار، شاید اس وقت وہ لونڈا آنے والا ہو گا۔ تب ہی یہ تیاریاں ہیں ورنہ سونے کے وقت کنواریوں کو بناؤ سنگار کی کیا ضرورت، جگنو کی رائے میں عورتوں کے بناؤ سنگار کا صرف ایک مدعا تھا، خاوند کو لبھانا۔ اس لئے سہاگنوں کے سوا سنگار سب

مس خورشید نے قہقہہ لگا کر کہا تم نے اپنا پارٹ خوب کھیلا لیلا ورنہ صاحب بھی چونک جاتے

لیلا: میں تو ڈر ہی گئی تھی کہیں بھانپ نہ جائے

مس خورشید: مجھے یقین تھا وہ آج ضرور آئے گی، میں نے دور ہی سے اسے برآمدے میں دیکھا، اور تمہیں اطلاع دی آج آشرم میں بڑے مزے رہیں گے، جی چاہتا ہے عورتوں کی باتیں سنوں، دیکھ لینا سب کی سب اس کی باتوں پر یقین کر لیں گی

لیلا: تم بھی تو جان بوجھ کر دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہو

مس خورشید: مجھے ناٹک کھیلنے میں مزا آتا ہے، ابھی دو دن کی دیر ہے گی بڑھیا نے بڑا ظلم کیا ہے اسے یہی دکھانا چاہتی ہوں کل تم اسی وقت اسی ٹھاٹھ سے پھر آ جانا، بڑھیا کل پھر آئے گی، اس کے پیٹ میں پانی نہ ہضم ہوگا جب وقت آئے گی بس خبر دوں گی بس تم جیسا ہی ہو لیا پہنچ جانا

(۵)

آشرم میں اس دن جگنو کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی، اس نے سارا حال مسز ٹنڈن سے کہا مسز ٹنڈن دوڑی ہوئی آشرم میں پہنچیں، اور دوسری عورتوں کو جو ساری جگنو اس کی تصدیق کرنے کے لئے بلا لیں، جو عورت آتی وہ جگنو کے منہ سے یہ کہانی سنتی ہر ایک بار میں کچھ نہ کچھ رنگ چڑھ جاتا، یہاں تک کہ دو پہر ہوتے ہوتے سارے شہر کے بڑے حلقہ میں یہ خبر پھیل گئی

ایک عورت نے پوچھا یہ آدمی ہے کون؟

مسز ٹنڈن: سنا ہے ان کے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے دونوں میں پہلے سے کچھ لگا چپ رہی ہوگی وہی تو میں کہتی تھی کہ اتنی عمر ہو گئی، یہ کنواری کیسے بیٹھی ہے اب قلعی کھلی

جگنو: اور کچھ بھیا مرا جوان تو ناکا ہے

ٹنڈن: یہ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا حال ہے

حگنو ایک کرسی کا تکیہ پکڑ کر کھڑے کھڑے بولی، سب خیریت ہے مس صاحبہ! میں نے کہا۔ آپ کو دعا دے آؤں، میں آپ کی لونڈی ہوں، جب کوئی کام پڑے، مجھے یاد کیجئے گا یہاں اکیلے تو حضور اچھا نہ لگتا ہوگا۔

مس۔ مجھے اپنی اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ سب میری ہی لڑکیاں ہیں۔

حگنو نے مادرانہ انداز سے سر ہلا کر کہا، یہ ٹھیک ہے مس صاحبہ! پرایا اپنا ہی ہے دوسرا اپنا ہو جائے تو اپنوں کے لئے کیوں کوئی روئے۔

اچانک ایک خوبصورت نوجوان ریشمی سوٹ ڈلنٹے اندر داخل ہوا مس خورشید نے اس طرح دوڑ کر اس کا استقبال کیا، گویا جامہ میں پھولی نہ سماتی تھی، حگنو اسے دیکھ کر کونے میں دبک گئی۔

خورشید نے نوجوان سے گلے مل کر کہا، پیارے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں (حگنو سے) ماں جی آپ جائیں، پھر کبھی آنا، یہ میرے پیارے دوست ولیم کنگ ہیں، ہم اور یہ بہت دنوں تک ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔

حگنو چپکے سے نکل کر باہر چلی آئی، خانساماں کھڑا تھا، پوچھا یہ لونڈا کون ہے؟

خانساماں نے سر ہلایا، میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے، شاید کنوارپن سے دل بھر گیا اچھا طرحدار جوان ہے۔

حگنو۔ دونوں اس طرح ٹوٹ کر گلے ملے ہیں کہ میں تو شرم کے مارے گڑ گئی، دونوں لپٹ گئے، لونڈا تو مجھے دیکھ کر کچھ جھجکا بھی پر تمہاری مس صاحبہ تو جیسے متوالی ہو گئی تھیں۔

خانساماں نے کہا۔ مجھے تو کچھ بے ڈھب معاملہ نظر آتا ہے۔

حگنو تو یہاں سے سیدھی مسز سٹدل کے گھر پہنچی، ادھر مس خورشید اور نوجوان میں باتیں ہونے لگیں۔

مگھو نے مصنوعی حیرت سے کہا ارے اب تک بیاہ ہی نہیں ہوا؟ ہمارے یہاں تو ہو جاتا ہے گے

خانساماں اچھا پہلوان ہے، ان کے ہاں تو کسی ہی عمر میں عمر بھر بیاہ نہیں کریں

مگھو نے افسردہ دلی سے کہا ایسی کو لڑکیاں تو ہم بھی بہت دیکھ چکی ہیں، ہمدم برادری میں کوئی اس طرح بیٹھے تو بڑی بڑی سہرتی ہو جائے، لیکن ان کے ہاں جو جی میں آئے کرو کوئی نہیں پوچھتا

اتنے میں ایک عورت سامنے نظر آئیں، گلابی جاڑا پڑنے لگا تھا اس لیے وہ ساڑی کے اوپر اوور کوٹ پہنے ہوئے تھیں ایک ہاتھ میں چھاتا تھا، دوسرے میں کتے کی زنجیر اسے کرسی میں اندر سے گالیاں کوستا ، اور سرج نادیا تھا، مگھو نے جھک کر سلام کیا انہوں نے اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا اور جا کر خانساماں کو بلا کر پوچھا، یہ عورت کیا کرنے آئی ہے؟

خانساماں نے جوتے کا تسمہ کھولتے ہوئے کہا، حضور اس سے مقصود یہ عورت سمجھ لیتے، میں نے کہا یہاں نوکری کرو گی؟ تو ابھی نہیں مولی پوچھے گی ان کے صاحب کیا کرتے ہیں، جب میں نے بتایا تو اسے بڑا تعجب ہوا اور ہونا ہی چاہیے، ہندوؤں میں تو دودھ پیتے بچوں تک کا بیاہ ہو جاتا ہے

عورت نے سوال کیا اور کہا کیسی بھی

"اور تو کوئی بات نہیں حضور"

"اچھا اسے میرے پاس بھیجو"

(۱۴)

مگھو نے یوں ہی کمرے میں قدم رکھا مس خورشید نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا، آئیے ماں جی، میں خدا معلوم کرنے چلی گئی تھی آپ کے آشرم میں تو سب خیریت ہے؟

جگنو۔ یہیں رہتی ہوں بیٹا، میم صاحبہ کہاں سے آئی ہیں تم تو ان کے پرانے نوکر ہو گے؟
خانساماں، ناگپور سے آئی ہیں مگر گھر بھی وہیں ہے، دس سال سے ان کے ساتھ ہوں۔
جگنو۔ کسی اونچے خاندان کی ہوں گی، وہ تو رنگ ڈھنگ سے ہی معلوم ہوتا ہے۔
خانساماں۔ خاندان تو کچھ ایسا اونچا نہیں ہے، ہاں تقدیر کی اچھی ہیں، ان کی ماں ابھی تک مشن میں تیس روپیہ پاتی ہیں۔ یہ پڑھنے میں تیز تھیں۔ وظیفہ مل گیا، ولایت چلی گئیں، بس تقدیر کھل گئی۔ اب تو اپنی ماں کو بلانے والی ہیں۔ لیکن وہ بڑھیا شاید ہی آوے، یہ گرجے ورجے نہیں جاتیں، اس سے دونوں میں پٹتی نہیں۔
جگنو۔ مزاج کی تیز معلوم ہوتی ہیں۔
خانساماں۔ نہیں مائی، بہت صاف ہیں۔ ہاں گرجے نہیں جاتیں، تم کیا نوکری کی تلاش میں ہو، کرنا چاہو تو کرا دوں، ایک آیا رکھنا چاہتی ہیں۔
جگنو۔ نہیں بیٹا اب میں نوکری کیا کروں گی، اس بنگلہ میں پہلے جو میم صاحبہ رہتی تھیں، وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں، میں نے سمجھا چلوں نئی میم صاحبہ کو دعا دے آؤں۔
خانساماں۔ یہ دعا لینے والی میم صاحبہ نہیں ہیں، ایسوں سے بہت چڑتی ہیں۔ کوئی مانگنے والا آیا اور اسے ڈانٹ بتائی۔ کہتی ہیں، بنا کام کئے کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، بھلا چاہتی ہو تو چپکے سے راہ لو۔
جگنو۔ تو یہ کہو ان کا کوئی دھرم کرم نہیں ہے، پھر بھلا غریبوں پر کیوں رحم کرنے لگیں۔
جگنو کو دیوار کھڑی کرنے کے لئے کافی مصالحہ مل گیا۔ نیچ خاندان کی ہیں۔ ماں سے نہیں بنتی، دھرم کرم سے خالی ہیں، پہلے دھاوے میں اتنی کامیابی کچھ کم نہ تھی، چلتے چلتے خانساماں سے اتنا اور پوچھا۔ ان کے صاحب کیا کرتے ہیں؟
خانساماں نے مسکرا کر کہا۔ ان کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی، صاحب کہاں ہوں گے۔

دیکھ لیجیے گا شکلے کی عورت یہاں راج کر رہی ہے، میں برداشت نہیں کر سکتی
وہ چلی گئیں تو مسز ٹنڈن نے مگھو کو بلا کر کہا ان سی مس صاحبہ کو دیکھا، بیمار پڑی ہیں،
مگھو نے لعن سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا آپ دیکھیں، میں ایسی سیکڑوں چھوکریاں دیکھ
چکی ہوں آنکھ کا پانی جیسے مر گیا ہو
مسز ٹنڈن آہستہ بولو تمہیں کچھ اس کا پاس ہی، ان سے منشی رہنا کہہ گئی ہیں میں
اسے ٹھیک کر کے چھوڑوں گی، ایسے سو حاسد مسز دار کردوں انسان ہو اُس کے سامنے
کچھ ایسی ویسی بات کہہ بیٹھو
مگھو نے گھونگھٹ کھینچ کر کہا، مجھے خبردار کرنے کی ضرورت نہیں انہیں خبردار
کر دیجیے گا یہاں کا آنا بند کر دیں تو اپنے آپ کی نہیں، وہ گھوم کر دیکھو آئی ہیں، تو بہاں
گھر بیٹھے دیکھ چکی ہوں
مسز ٹنڈن نے پیٹھ ٹھونکی میں نے سمجھا دیا تھا کہ تم جانو تمہارا کام
مگھو - آپ چپ چاپ دیکھتی جائیے کیسا ٹھیک کا ناچ نچاتی ہوں، اس نے اب تک بیاہ کیوں
نہیں کیا عمر تو بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔
مسز ٹنڈن نے رقت بھرا کہتی ہیں میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی، کسی مرد کے
ہاتھ کیوں اپنی آزادی بیچوں
مگھو نے آنکھ مٹکا کر کہا، کوئی پوچھتا ہی نہ ہوگا ایسی بہت سی کنواریاں دیکھ
چکی ہوں، ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔
اتنے میں اور کئی مستورات آگئیں اور بات کا سلسلہ بند ہو گیا

(۳)

دوسرے روز مگھو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی، لالعاں سے مس خورشید ہوا کھانے گئی
ہوئی تھیں، خانساماں نے پوچھا کہاں سے آئی ہو؟

جگنو کئی کئی دفعہ کرے میں آکر مس خورشید کو متجس نگاہوں سے دیکھ چکی تھی، جیسے کوئی شہسوار سی گھوڑی کو دیکھ رہا ہو۔
مسز ٹنڈن نے مسکرا کر جواب دیا، یہ اوپر کا کام کرنے پر نوکر ہے، کوئی کام ہو تو بلاؤں
مس خورشید نے شکریہ ادا کر کے کہا جی نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے، مجھے چالباز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھ رہی ہوں، یہاں پر وہ نوکر نہیں بلکہ مالکہ ہے۔
مسز ٹنڈن تو جگنو سے جلی بیٹھی ہی تھیں، ان بیوی پر داغ لگانے کے لئے وہ سدا سہاگن کہا کرتی تھی، مس خورشید سے اس کی جتنی برائی ہو سکی وہ کی، اور اسے خبردار رہنے کا مشورہ دیا۔
مس خورشید نے سنجیدگی سے کہا، تب تو خوفناک عورت ہے، ابھی سب عورتیں اس کا پنجی رہیں، آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں، ایسی چڑیل کو ایک دن بھی نہ رکھنا چاہیئے۔
مسز ٹنڈن نے اپنی مجبوری ظاہر کی، نکال کیسے دوں زندگی مشکل ہو جائے، ہماری قسمت اس کی مٹھی میں ہے، آپ دو چار دنوں میں اس کے جوہر کھلیں گے، میں تو ڈرتی ہوں کہیں آپ بھی اس کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔ اس کے سامنے بھول کر بھی کسی مرد سے بات نہ کیجئے گا، اس کے مخبر نہ جانے کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں، نوکروں سے مل کر بھید یہ لے، لڑکیوں سے مل کر خط یہ دیکھے، لڑکوں کو پھسلا کر گھر کا حال یہ پوچھے، اس رانڈ کو تو خفیہ پولیس میں بھرتی ہونا چاہیئے تھا۔ یہاں نہ جانے کیوں آمری۔
مس خورشید فکر میں ڈوب گئی، گویا اس عقدہ کے حل کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہو ایک لمحہ بعد بولیں۔ اچھا میں اسے ٹھیک کروں گی۔
مسز ٹنڈن۔ نکال دینے ہی سے کیا ہوگا، اس کی زبان تو بند نہ ہوگی، تب اور بھی نڈر ہو کر کیچڑ اچھالے گی۔
مس خورشید نے اطمینان کے لہجہ میں کہا، میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی بہن آپ

(۱)

دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا ہوتا جس کی نگاہ لوگوں کے دلوں کے اندر گھس سکتی تو ایسے بہت کم لوگ ہونے جو اس کے سامنے سیدھی آنکھیں کر کے دیکھ سکتے، مہیلا آشرم کی جگنو بائی کے متعلق لوگوں کو ایسی ہی نگاہ رکھنے کا گمان تھا، وہ ناخواندہ غریب بوڑھی عورت تھی۔ مسکین صورت لیکن جیسے کسی ہوشیار پروف ریڈر کی نگاہ غلطیوں ہی پر جا پڑتی ہے اس کی آنکھیں بھی باطن کے داغوں پر جا پڑتی تھیں، شہر میں ایسی کوئی سربرآوردہ خاتون نہ تھی جس کے متعلق دو چار راز کی باتیں اسے نہ معلوم ہوں، اس کا پست قد نحیف جسم سفید بال اور پر شکن چہرہ اس کی جانب سے حسن ظن پیدا کرتے تھے، مہیلا ئیں اسے اپنا محرم راز بنا لیتی تھیں اور ہمیشہ کے لئے اُس کے دام میں پھنس جاتی تھیں، جس پر وہ ایک بار قابو پا لیتی اُس پر سختی سے حکومت کرتی، اس کا کام مہیلا آشرم میں عورتوں کی خدمت، تواضع کرنا تھا، جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن دیویاں اس کی صورت سے کانپتی تھیں، اس کا ایسا رعب تھا کہ جوں ہی وہ کمرہ میں قدم رکھتی لبوں پر آئی ہوئی ہنسی جیسے رو پڑتی تھی، چہکنے والی آوازیں خاموش ہو جاتی تھیں، گویا اس کے چہرہ پر دیویوں کو اپنے پچھلے کارنامے لکھے نظر آتے ہوں، پچھلے کارنامے! کون ہے جو اپنے پچھلے کارناموں کو کسی خونخوار درندے کی طرح پنجرے میں بند کر کے نہ رکھنا چاہتا ہو، وہ راز جو پہلے ایک کیڑے کی طرح حقیر اور کم بضاعت تھا، دنوں کے ساتھ جسیم اور خوفناک ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ہم اس

پُر خوف زندگی کے لئے میں کسی انسان کا احسان نہیں لینا چاہتا، اگر تم نے راہبوں کے مجموع
پابند رہنا تو میں زہر کھا لوں گا۔"
گوری اس کے چہرہ کی طرف متحیرانہ نظروں سے تکتی رہ گئی۔

دینا ناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا، تو تمہارا خیال ہے، میں ایشور کے رحم سے اچھا ہو گیا

"اور کیسے اچھے ہوئے!"

"اچھا ہوا اس لئے کہ زندگی باقی تھی!"

"ایسی باتیں نہ کرو ماننا پوری کرنی ہوگی!"

"ہرگز نہیں، میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا!"

"اور کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے!"

"اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل ہستی دنیا میں نہ ہوگی، جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو اس کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزا یہ دے کہ انہیں دوزخ کے اگن کنڈ میں دھکیل دے، وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا، ایسے بھگوان کے تخیل سے ہی میری روح کو لرزہ آتا ہے۔ محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے، عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دنیا کی علت قرار دیا ہے، برتاؤ میں نہ سہی تخیل میں ہی، محبت ہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے اگر تمہارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے، پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا، ایسے ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا، نہیں کر سکتا، جو لوگ موٹے ہیں ان کے لئے ایشور رحیم ہوگا، کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں، ہم مصیبت زدوں کو تو ایشور کی کرپا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے یہ مت کرو، نہیں ایشور سزا دے گا۔ وہ مت کرو، نہیں دوزخ میں جاؤ گے، ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی، محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے، خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے، ایسے قہار اور جبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں اچھا ہے، اسے دل سے نکال کر میں اس کے رحم اور اس کے قہر دونوں ہی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ ایک کلمہ تحقیر برسوں کے پریم کو خاک میں ملا سکتا ہے، میں تمہارے اوپر اپنی جان دیتا رہتا ہوں، لیکن کسی دن ایک طعنہ دے دوں تو میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرو گی۔ ایسی پرعذاب

کہ خود برہم علی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لگاتار رہتا تھا، وہ ایک پل بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر سکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہوا تھا، بچے کو بخار آنے لگا، دینا ناتھ کی جان ماحس میں سما گئی۔ کہاں جائے کیا کرے، جیسے عقل مدب ہو گئی ہو۔

گوری نے کہا، جا کر کوئی دوا لاؤ، یا کسی ڈاکٹر کو دکھا دو، تین دن تو ہو گئے۔

دینا ناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا، ہاں جاتا ہوں، لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے۔

"اندیشہ کی کون بات ہے، بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو، آج کل کسے بخار بخار نہیں آتا؟"

"ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے؟"

"ایشور بے رحم ہے گنہگاروں کے لئے، ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے!"

"کیا ایشور گنہگاروں کو کبھی معاف نہیں کرتا؟"

"گنہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ رہنے پائے۔"

"لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے، جو ایک خیال سے گناہ ہو سکتے ہیں، دوسرے خیال سے عین ثواب۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"مان لو میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ گناہ ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے۔"

دینا ناتھ کو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلا لایا۔ علاج شروع کیا ایک ہفتہ میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ خود بیمار پڑا، اب کے صرف اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے

لیکن ضمیر کو کچلنے کے بعد اُسے اپنے وعدہ کا خیال آیا بھائیوں کی نظر میں تو جعل جعل ہے
خواہ کسی سبب سے بھی کیا جائے
بولا لیکن کہیں یہ راز کھل گیا تو مجھے سزا ہو جائے گی چودہ سال کا کالا پانی لکھا ہوا ہے
سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے میں پھنسوں گا تم
صاف انکار کر سکتے ہو۔
"تحریر میں کچھ نہ کچھ امتیاز تو رہے گا
"یہ ہی کیسے چلے گا اگر کوئی ماہر منہ لگا ہے مگر تحریروں میں کچھ امتیاز ہے بھی
تو ناقابل احساس"

دینا ناتھ لاجواب ہو گیا، اسی وقت اس صفحے کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا
پھر بھی دینا ناتھ کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا گوری کو اس نے سر کیسا دہرا رکھا
ایک ہفتہ بعد اس کی ترقی ہو گئی، سو روپے ملنے لگے، دو سو بونس کے بھی ملے
یہ سب کچھ ہوا، گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے، لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر
ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا، چند دنوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ ان دنوں
سے گوری کی زبان بند کر سکنے کا افسوس اسے رہتا اسے اب سالہ دنوں کا اصلی پہلو نظر آنے
لگا تھا، اس کی خطا پرستی، روحانی بعد پیسے کے پہلے اسے پاگل کر دی رہتی تھی، اپنا کیا گناہ کا خوف
اس کے دل میں سما رہتا تھا، اس گناہ کی سزا اسے ضرور ملے گی، کسی نہ کسی شکل میں ضرور اس
سزا سے بچ نہیں سکتا، ابھی نہ ملے، سال دو سال نہ ملے، دس پانچ سال نہ ملے لیکن جبھی ہی اور
میں ملے گی اسی تک ہولناک ہو گی، اصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا وہ اکثر چھپا تا تھا
سیٹھ جی کو رعب میں کیوں آ گیا، کاروبار تو تتلا رہتا، تیری نا ہے، مجھے تو روحانی
کا سکون قلب اس کا طمانیت، اس کی معمولی رخصت ہو گئی، وہ اس گناہگار کا احساس

نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں ان کی ذاتی غرض شامل ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے لیکن بہر حال ہے یہ تحریف اور تلبیس تو کیا وہ ذاتی نفع کے لئے اپنے ضمیر کا خون کرے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، آپ مجھے معاف کریں، میں یہ خدمت نہ بجا لا سکوں گا میں اسے اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہیں آیا، اسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے کیوں؟

"اس لئے کہ یہ سراسر جعل ہے"

"جعل کسے کہتے ہیں؟"

"نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے"

"لیکن اگر اس تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے۔ کمپنی کی اصلی حالت کچھ ہے، کاغذی حالت کچھ اور ہے، اگر تغیر نہ کیا گیا تو فوراً کئی لاکھ روپے کے نفعے دینے پڑ جائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کا دیوالہ ہو جائے گا اور یہ سارے آدمی بیکار ہو جائیں گے، میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لئے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے، غریبوں کی بہتری کے لئے اگر کچھ جعل بھی کرنا پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا، اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا، میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں، جس کام سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے"

دیا ناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا، اگر سیٹھ جی کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا، یہ جعل نہیں ناگوار فرض ہے، اگر ضمیر کا خون بھی ہوتا ہے تو اتنے آدمیوں کی بہتری کے لئے اس کا خون بھی کرنا پڑے گا

میں اپنی ذمہ داری کا اتنا کم احساس ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جائے تو لوگ اس کی شرافت
اور انسانیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں اور اپنے کام سے بے توجہی کرنے لگتے ہیں۔
انہیں اپنے کام کی اتنی پروا نہیں رہتی جتنی اپنے افسر کی خوشامد اور مصاحبت کی۔ کچھ
ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں۔ ان سے ہنستے بولتے بھی
ہیں، ان کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں پھر بھی نوکروں کو ان سے زیادہ بے تکلف
ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اور بھی تن دہی سے اپنا کام کرتے ہیں، مالک سے انہیں
ہمدردی ہو جاتی ہے، میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوا، مجھ میں وہ فن نہیں ہے، اس
لئے میں اپنے آدمیوں سے کھنچے رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں، اور اب تک اس طرز عمل
سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا، لیکن آدمیوں سے علیحدہ رہ کر بھی میں ان کے رنگ ڈھنگ
دیکھتا رہتا ہوں۔ اور ان کی فطرت کا امتحان لیا کرتا ہوں۔ میں نے اب تک تمہارے
متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ تم وفادار اور با اصول آدمی ہو اور میں تمہارے
اوپر اعتبار کر سکتا ہوں، اس لئے میں تمہیں زیادہ ذمہ داری کا کام دینا چاہتا ہوں۔
جہاں تمہیں خود بہت کم کام کرنا پڑے گا، صرف نگرانی کرنی پڑے گی، تمہاری تنخواہ میں
پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا، اور اختیارات بڑھ جائیں گے، مجھے یقین ہے، اب تک جس
تندہی سے تم نے کام کیا ہے آئندہ اس سے بھی زیادہ توجہ اور خلوص سے اپنا کام کرو گے۔
دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی، جی میں
آیا آقا کے قدموں پر سر رکھ دے، اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لئے میری جان حاضر ہے
آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے اور مجھ پر جو اعتبار کیا ہے میں اس کے لائق بننے کی
کوشش کروں گا۔ آواز قابو میں نہ تھی، جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے، صرف
احسان مند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا، مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا شاید وفاداری اور
تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا۔ سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے

تحصیل مرچی ہے

تیری آج تحصیل مرچی ہی پہ مال ہے، سوچا ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن گھر میں اندھیرا پڑا رہا، ایک دن آج ہے کہ ہر ایک ہر طرح جلانے کے لائق ہیں، کیا بھگوان نے ہمیں کام سونپ دیا ہے، سب ہی روشنے جاتے ہیں، یہ کیسی بڑی ناشکری ہے۔

ستیہ چھایہ جہاں سے سب مرود ملاؤ، تمہارا اپیل پاس ہو گیا۔

ایک دن وسانا تھ شام کو دفتر سے چلنے لگے تو سیٹھ جی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھا کر بولے تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے سال بھر تو ہو گیا ہوگا۔

وسانا تھ نے ادب سے کہا، جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے

"آرام سے بیٹھو، اس وقت گھر جا کر کچھ چائے وائے پیتے ہو؟"

"جی نہیں میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔"

"پان واں تو کھاتے ہی ہو گے جوان آدمی ہو کر ابھی سے اتنا پرہیز؟"

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی، اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا،

حالانکہ وسانا تھ برابر انکار ہی کرتا رہا اسے شک ہو رہا تھا کہ آج یہ غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے کہاں تو صرف سلام ہی نہ لیتے تھے کہاں آج مٹھائیاں اور پان بھی کچھ مطلب ہے معلوم ہوتا ہے سیٹھ جی میرے کام سے خوش ہو گئے ہیں اس خیال سے انہیں پہلے پہل کچھ اعتماد پیدا ہوا اور اپنے گھر کی یاد آ گئی، یہ تمام عمر وہ حاضر و ناظر ہے اور نہ مجھے کون پوچھتا، مگر میں ہمارا عہدہ بھی تو اونچا نہیں

اردلی پان اور مٹھائیاں لایا، وسانا تھ اصرار سے مجبور ہو کر مٹھائیاں کھانے لگا

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا تم نے مجھے بے شک ایک سخت آدمی پایا ہوگا

میرے ملازموں کو مجھ سے یہ عام شکایت ہے مگر میں مجبور ہوں ہمارے یہاں ابھی لوگوں

بھاؤں بھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی تھی، بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا، تو دینا ناتھ مخالفت کرتا۔ دینا ناتھ کی طرف سے پیش ہوتا تو گوری اس کا بخیہ ادھیڑتی۔ بل کو پاس کرا لینا گوری کی لیاقت اور وکالت پر منحصر تھا۔ سرپنچائی کرنے والی کوئی تیسری طاقت نہ تھی۔

دینا ناتھ اب پکا مادہ پرست ہو گیا تھا۔ ایشور کے رحم اور انصاف میں اسے کوئی شک نہ تھا۔ وہ سندھیا کرتا اور بلا ناغہ گیتا پڑھتا۔ ایک دن اس کے ایک منکر دوست نے جب ایشور کی مذمت کی تو اس نے کہا، بھائی صاحب! اس کا تو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں۔ منکر اور موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں لیکن میرے خیال میں موحد رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت آمیز ہے۔ اگر ایشور کا وجود ہے تب تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کہیں ٹھکانا نہیں، موحد کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے، اس کے لئے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایشور نہیں ہے تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے، دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے۔ منکر دوست اس کی اس دورخی دلیل پر منہ بنا کر چلا گیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دیوالی کا دن تھا، گوری نے اس کے ایک ہزار چراغ جلانے کا بندوبست کیا دس سیر تیل لیا اور سارے دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی۔ شام کو جب دینا ناتھ دفتر سے آئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے تمہیں بھی سنک سوار ہو گئی۔ بل پیش کرنے سے پہلے ہی اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنے کے تیل میں کیا کام نہ چل سکتا تھا۔

گوری مسکراتی ہوئی بولی، اسے کبھی غصہ نہ آتا تھا، کام کیوں نہ چل سکتا تھا، پچھلے سال تو دھیلے کا تیل بھی نہیں آیا، کیا اس کا کام نہیں چلا۔

”میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں، یہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا؟

دلچسپ کام مشغلہ سمجھا، صرف ایک بجے ملد کو وہ اسٹ کا وقفہ ملتا تھا، اس میں جس کا جی چاہے
پان کھائے، سگریٹ سے یا چائے پیے، اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا، حالانکہ کی
تنخواہ سے پابندی کی مانگ تھی اور اعلان کہ خواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی، تعطیلات میں تنخواہ
رہا اور حساب عمال سے رہا، ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا، اس کو تو بس ملتا تھا، اور اپنے بچے
تنخواہ کی بہت سہولت تھی، پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ رہتا، کام کی کثرت یا پابندی اوقات کی کسی
کو شکایت نہ تھی، شکایت تھی صرف مالک کے تھوڑے پن کی کہ کتنا ہی دل لگا کر کام کرو،
مالک کی زبان سے دو شکریہ کا ایک لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص
کے منہ سے نہ نکلا

مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں، دستانے کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی، اس
ناقدرشناسی کے مقابلہ میں اس روکھے پن اور سرد دلی کی حقیقت ہی کیا تھی، وہ گھر کیسا اور بھیکا
مارا شاید حرف شکایت زبان پر لاتا، سیٹھ اور تقسیم میں بھی وہ شریک نہ ہوتا، احسان
سے اس کا ایک ایک رواں گرانبار ہو رہا تھا، سال بھر میں آپ کی کھانے سعادی کی
بدولت اس نے سارا قرض چکا دیا، اور کچھ پیسے اندوختہ بھی کر لیا، وہ ان لوگوں میں تھا جو
تھوڑے میں بھی خوش رہ سکتے ہیں، اگر معین وقت پر ملتا جائے، چار روپے روز میں سارا
وہ وقت نہ سوچی جو پچاس روپے ماہوار میں بھی، مرد کی مصارف کی مدیں قائم ہو گئی
تھیں، زندگی کی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کیے بے کھٹکے چلا جاتا تھا
عشر معین اصل میں وہ ہمیشہ کیسے سارا کیسے اس کی پابندی کرتا، کبھی اچانک تیر آتی تو دوسری
جب کم شمالی اور دوسری آتی تو مسری کا رونا ہوتا، کبھی کسی علاج کی بھی چاہیے وصولی
کی ہوا اس کلی کے سبب سے بہرہ ہے، اور کبھی جلے اور کبھی گھر جائے، کبھی یہی ہے کبھی
سٹھ مرچیا والی زندگی اسے مطلق پسند نہ تھی، اسعر وعدے کے علاوہ ایک روپیہ بھی
کسی خاص کام کے لیے خرچ کرنا پڑتا تو مہاں سوچ میں گھنٹوں کٹ دیکھیں جملتی اور ٹری

دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتا تھا، بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا اور مصیبت کے ایام کٹ گئے۔

گوری نے خوش ہو کر کہا، میں کہتی نہ تھی کہ ایشور سب کی سدھ لیتا ہے اور کبھی کبھی ہماری سدھ بھی لے گا، مگر تمہیں یقین نہ آتا تھا، اب تو ایشور کی رحیمی کے قائل ہوئے۔

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا، یہ میری دوا دوش کا نتیجہ ہے، ایشور نے کیا کیا ایشور کو تو جب مانتا کہ کہیں سے چھپر پھاڑ کر بھیج دیتے۔

"ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے، سنا نہیں ہے،" حیلے روزی بہانے موت"

"جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے، مجھے ایشور پر وشواش نہیں آنے کا"

لیکن منہ سے چاہے جو کہے اس میں شک نہیں کہ اس کے اوپر کھر میں بھی اعتقاد کے بیج پڑ چکے تھے۔ اور اس میں انکھوے بھی نکل آئے تھے۔

(۲)

دینا ناتھ کا آقا نہایت کج خلق آدمی تھا، اور کام میں بڑا چست، اس کی عمر پچاس سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہو چکی تھی، سا گو دانہ کے سوائے اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی، پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا، مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے، یا ایک منٹ بھی وقت معین سے پہلے چلا جائے، خود نہ جانے کب آتا تھا، اور نہ جانے کب جاتا تھا۔ عملے والے جب دفتر آتے تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا، اور جب جاتے تب بھی وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا، لوگ اس کے سامنے جاتے ایسا ڈرتے تھے گویا کاٹ کھائے گا، دس منٹ تک کلیجہ مضبوط کرتے اور فراغت پاتے ہی ایسا بگٹٹ بھاگتے گویا قید سے چھوٹے ہوں، ہلنے کو تو کسی کو مہلت نہ تھی بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے، نہ جانے اس کے کتنے نئے نئے نام رکھ لئے گئے تھے اس کے حرکات و سکنات کی تضحیک کرنا ہی لوگوں کی

گمانی نے دوسرا گھر کر لیا۔

کالی نے کہا۔ گھر کیا کرے گی ٹھینگا ہے، برادری میں ایسا اندھیر، پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔

ہری نے کہا نہیں کالی بہت اچھا ہوا، لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں، میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے گلے نہ آ پڑے، بھگوان نے میری سن لی، میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔

۷

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی سہما آئے کچھ سہمے اندر دوڑے
گئے اور ماں کو خبر دی۔

اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی
ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے، اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا جہاں
پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی، وہاں اب مایوسی تھی شکست تھی اور طلب بھی، مرض کا
[زور] گھٹ چلا تھا اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی، قلعہ کی دیواروں میں سوراخ
ہو گئے تھے اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا وہی گھر جس سے وہ ایک مرتبہ رنجیدہ خاطر
ہو چکا تھا اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کو تیار تھا، ناامید لڑکا ہری دھن
اس سہارے کو پاکر بالکل مطمئن ہو گیا

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا بیٹا تم گھر آگئے ہمارے دھن بھاگ، اب ان بچوں
کو پالو، ماں کا ماننا نہیں، باپ کا نام ہے، مجھے ایک روٹی مل جائے وہی کھا کر ایک کونے میں
پڑی رہوں گی، تمہاری اماں سے میرا بہن کا ناتا ہے اس ناتے سے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو
ماں کے لئے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا
گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا صرف چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا، وہی سوتیلی ماں
کے چہرہ پر بھی نظر آرہا تھا

دوسرے دن ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا اس کے چہرہ پر
خوشی تھی اور اس کی آنکھوں میں غرور تھا، وہ اب کسی کا سہارا لینے والا نہیں، بلکہ سہارا دینے
والا تھا، کسی کے در کا بھکاری نہیں، بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا

ایک دن اس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا وہ ماں سے بولا [illegible]

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی۔ وہ سر سہلاتا ہوا بولا یہ کون شیطان ہے، نہیں مانتا، ٹھہر تو میں آکر تیری خبر لیتا ہوں، اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا، دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے، متحیر ہو کر بولا ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو۔

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے، چلو گھر چلو۔ بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے؟"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا، منگرو ان آموں میں جو سواد (لذت) ہے وہ اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے، گاؤں کیا رنگ ڈھنگ ہے؟

منگرو۔ سب چین چان ہے بھیا، تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا، اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے، جب سے تمہارے دادا مرے ساری گرستی چوپٹ ہو گئی، دو چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے کئے کیا ہوتا ہے۔

ہری دھن۔ مجھے اب اس گرستی سے کیا واسطہ ہے، کھائی ہیں تو اپنا لے دے چکا، مجوری تو ملے گی نا، تمہاری گیا (گائیں) میں ہی چرا دیا کروں گا، مجھے کھانے کو دے دینا۔

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لئے جان تک حاضر ہے، کیا سسرال میں اب نہ رہو گے، تو کوئی چنتا نہیں، پہلے تو تمہارا گھر ہی ہے، اسے سنبھالو، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو پالو، تم نئی اماں سے ناحق (ناحق) ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بیچاری، بس اپنی ماں ہی سمجھو، تمہیں پاکر تو نہال ہی ہو جائیں گی۔ اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے۔

ہری دھن۔ اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا، میرے لئے وہ مر گئی۔

منگرو۔ تو دوسری سگائی ہو جائے گی، اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو دھو کر پیو گے، پر کہیں پہلی آگئی تو؟۔

ملن آموں کھولے سوسے اسے ملا رہی ہو، جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا جہاں وہ آموں پر
میٹھے سے اُسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا جہاں کے کچے سر اور سوٹوں میں ایک مٹھاس
تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا، گویا ماں کو اپنی مصیبت کی
داستان سنا رہا تھا، وہاں کی ہوا میں وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت
بڑی سی صورت پھیلی رہی تھی، وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے معطر
سی ہوئی تھی ماں کے محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے وہاں کی
آب و ہوا میں جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر شگفتہ
سے کر دیا، وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کر کھانے لگا ساس کی وہ سخت کلامی
بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا، اس کے پاؤں
پھول رہے تھے تلوے جل رہے تھے، مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات
کا خیال نہ تھا

یکایک باغ کے رکھوالے نے پکارا یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے بیٹے، اترو ابھی نہیں
تو ایسا پتھر کھینچ کر ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا

اس نے گالیاں بھی دیں، مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف
آ رہا تھا، وہ ڈالیوں میں چھپ گیا اس نے کئی آم کاٹ کاٹ کر نیچے گرائے اور زور سے قہقہہ
لگا کر ہنسا ایسی ہنسی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی

رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی، مگر ہری دھن یہاں کہاں! وہ تو
سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے کیسا ہنسوڑ تھا، کیسا چلبلا، نہ جانے بیچارے کا کیا حال ہوا
پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا، اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟

ڈانٹ کر بولا وہاں سے بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو آ کر ساری ہنسی نکال دوں گا نہیں
سیدھے سے اتر آؤ

دفعتاً گمانی نے آکر پکارا، کیا سو گئے تم، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے، کب تک کوئی تمہارے لئے بیٹھا رہے۔

ہری اٹھ بیٹھا اور ایک تلوار سی نیام سے نکال کر بولا، بھلا تمہیں میری سدھ تو آئی، میں نے تو کہہ دیا تھا، مجھے بھوک نہیں ہے۔

گمانی۔ تو کے دن نہ کھاؤ گے؟

ہری۔ اس گھر کا پانی نہ پیوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟

ان مصمم ارادہ سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اٹھی، بولی کہاں جا رہے ہو!

ہری نے گویا نشہ میں کہا، تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں، پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔

گمانی معترضانہ لہجہ میں بولی، تم بتاتے کیوں نہیں، کہاں جا رہے ہو؟

"تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟"

"جب تک تم نہ بتا دو گے میں نہ جاؤں گی۔"

"تو معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی، مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا، نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا، اور اپنے گھر کی طرف چل دیا، گمانی "سنو تو، سنو تو" پکارتی رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(۶)

تیس میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی، جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کا ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل ان کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا، ان درختوں کو دیکھ کر اس کا بیقرار دل ناچنے لگا، مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گویا ایک ہی جست میں وہ اس کے اوپر جا پہنچے گا، وہ تیزی سے دوڑا جا رہا تھا گویا اس کی

زبردست خواہش کو روک نہ سکا۔ اسی طرح بولا میرے بھی آنکھیں ہیں، اندھا نہیں ہوں۔ نہ بہرا ہوں، چھاتی پھاڑ کر کام کروں اور ساس بر بھی کتا سمجھا جاؤں، ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے
اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے، تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔

ہری دھن لاجواب ہوا، کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا، اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی آدر ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا، کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں۔

بڑے یہ کون کہتا ہے۔

ہری۔ تو تمہارے گھر کی یہی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔

بڑے۔ تم خود کھانے نہیں گئے، کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا، میں خود کھانے نہیں گیا، کہتے تمہیں لاج نہیں آتی۔

بڑے۔ نہیں آئی تھی بہن تمہیں بلانے۔

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا، دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا، اماں بھی تو آئی تھیں، تم نے کہہ دیا، مجھے بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں۔

ساس بھی اندر سے نکل آ رہی تھی، سن کر بولی، کتنا کہہ کر ہار گئی، کوئی اُٹھے نہ تو میں کیا کروں!

ہری دھن نے زہر، خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا، تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لئے ہوں۔ میں کتا ہوں، کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو۔

بڑھیا نے اینٹھ کر کہا، تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟۔

ہری دھن شکست کھا گیا، بڑھیا نے ایسا جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا اس کی

کے نفع و نقصان کا خیال اسے بھی تھا، وہ بھی اس مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور انہیں نگاہوں سے دیکھتی جن سے اس کے گھر والے، پھر جو دو ہزار میں کیا کسی کو سو لے ملیں گے، دو سال میں دو ہزار لد ہوتے پھر کیا ہے، دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے، ایک آدمی سال بھر میں دو سو بھی نہ کھا سکے گا، پھر کپڑے لے دودھ گھی سبھی کچھ تو ہے، دس سال ہو گئے ایک پیسہ کا چھلا بھی نہیں سا گھر سے نکلے تو جیسے ان کے یہاں جاتے ہیں، جاتے ہیں، جیسے پہلے ہوا ہوتی تھی ویسی ہی ہوتی رہے گی، یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے، جو پہلے سسرال جاتا ہے تو اس کا کتنا اہتمام ہوتا ہے، ڈولی سے اترتے ہی ناچ گانے ہوں گے اس محلہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں، پہنوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے اچھا پہننے کو، کوئی کام نہیں لیا جاتا، لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی اس کی بات بھی نہیں پوچھتا وہ گھر بھر کی لونڈی ہو جاتی ہے ان کے گھر میں سری بھی تو ویسی ہی ہوئی، اب یہ کیا کہ ہر وقت کا اچھوت کہو، کہ میں تو کام کرتا ہوں، تو یہ تمہاری بھول ہے، مجبوری کی ادھ مانس ہے، آدمی ٹوٹا بھی ہے، مارتا بھی ہے، جب چاہتا ہے رکھتا ہے جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے، پکڑ کر کام لیتا ہے، یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے

(۴)

سری ابھی بیٹھا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے، بڑے صاحب بولے بھیا اٹھو تیسرا پہر ڈھل گیا، کب تک سوتے رہو گے؟

ہری دھن چونکا اٹھا اور رکھائی میں بولا کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے۔

دونوں ششدر رہ گئے جس آدمی نے کبھی ماں نہیں کھولی ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا وہ آج یکا یک اتنا مغرور ہو جائے، یوں آنکھیں چڑھا کر گرم ہو جائے یہ انہیں ہوش میں لانے کے لئے کافی تھا، کچھ جواب نہ سوجھا

سری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں بس ایک دھکا دینے کی

(۴)

ہری دھن تو ادھر بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور دونوں سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں، گمانی بھی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔

بڑے سالے نے کہا، ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکہ تھوڑا ہی لے لیا ہے، دس سال ہو گئے، اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے!۔

چھوٹا سالا بولا مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی، ڈانٹے بھی، انہیں کوئی کیا کہے، نہ جانے، ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں، اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے نہیں دے رکھے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار کب کے صاف ہو گئے، سوا سیر تو ایک جون کو چاہیئے۔

ساس نے متانت سے کہا بڑی بھاری خوراک ہے۔

گمانی ماں کے سر سے جوں نکال رہی تھی، بولی نکھٹو آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے۔

بڑا سالا۔ کھانے کی کوئی بات نہیں ہے، جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے، مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہیئے، یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کٹے ہیں۔

چھوٹا سالا۔ میں تو ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ اپنی راہ لیجئے، آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے۔

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی، اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس گھر میں اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی، وہ بھی رانی بن کر رہتی، نہ جانے کیوں کہیں باہر جا کر کماتے ان کی نانی مرتی ہے

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی بالکل طفلانہ تھے، اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا، اسی گھر

اس ی دنیا میں آکر بہو ی دلہن کو پھر ایک مرتبہ کی محبت کا سلسلہ ملا، اس کی ساس
نے کسی رشتے کے بدوان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا، اس طرح
ہر بالی پیدا ہو گئی، سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں، ساس کی شفقت میں، سالوں کے ادب
میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں، ساس کبھی بیٹا
کہ اس گھر کو اپنا ہی سمجھو، انہیں میری آنکھوں کے سامنے رہو، وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بھول
کی شکایت کرتی، وہ دل میں کہتا تھا کہ ساس جی مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہیں
باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا، اور اپنے حصہ کی جائیداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے
پھر واپس آگیا، اب اس کی زندگی تندرست ہونے لگی، اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے
چرنوں پر رکھ کر اپنے کو خوش نصیب سمجھا تاہم اسے کبھی کبھی گھر کی یاد آجاتی تھی بلکہ
بھی اس کی یاد ستاتی تھی، گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا، جسے بھول جانا
ہی بہتر تھا، وہ سب سے پہلے اٹھتا سب سے زیادہ کام کرتا، اس کی محنت و مستعدی دیکھ کر
گاؤں کے لوگ داموں نے انگلی دبا لیتے تھے، اس کے خسر کی سب کو سراہتے ایسا
داماد ملا تھا، لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی خاطرداری میں کمی واقع ہوتی گئی
وہ پہلے دیوتا تھا پھر گھر کا آدمی اور بالآخر وہ گھر کا غلام ہو کر رہا، روٹیوں میں
بھی خلل واقع ہوا، تو ہمیں ہونے لگیں، اگر گھر کے لوگ بھوکوں مرتے اور ان کے
ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی، لیکن جب وہ
دیکھتا کہ اور لوگ مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں، صرف میں ہی دودھ
کی مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے ایک آہ سرد نکل جاتی ابھی وہ صرف
پچیس ہی سال کا تو تھا، اسی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی
اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں، یہ اس کی مصیبت کا سب
سے زیادہ دردناک پہلو تھا

کانا دیا ہے، جس پر پھول پانی چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا، وہ سولہ سال کا تھا، مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں جیسے اس گھر پر اس کا کوئی حق ہی نہ رہا ہو، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، بھائی کوئی نہ تھا۔ بیچارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ ماں کے لئے روتا تھا، مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا، جس کوٹھڑی میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا، گھر میں ایک بوا تھی، جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی، اسے اب دودھ زیادہ ملتا، کام بھی کم کرنا پڑتا، بوا بار بار پوچھتی، بیٹا کچھ کھاؤ گے؟ باپ بھی اب اسے زیادہ پیار کرتا، اس کے لئے ایک گائے الگ منگوا دی تھی، کبھی کبھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے، مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے جس نے دل کو مجروح کر رکھا تھا، یہ لاڈ پیار بار بار اس کو ماں کی یاد دلاتا، ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا، وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا، مانگ مانگ کر کھاتا تھا، لڑ لڑ کر کھاتا تھا، اب وہ بیمار تھا، اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں مگر اسے بھوک نہ تھی۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا، پھر تغیر واقع ہوا، ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے، اس کے گھر میں آئی، اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھا گئی، ساری ہریالی، سارے اُجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا، ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی، اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں، ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا، مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا جس دن باپ کے انتقال کی خبر ملی اسے ایک قسم کی حسد آمیز مسرت ہوئی، اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

مر جائے گا، کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا، یہ میری ہی بدی ہے جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ
سواہا کر دیا مجھے اُلو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں، وہ اب کہاں
جائے کیا کرے

اس کی ساس اکڑ کر بولی، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی، روٹھتے کس سے ہو، یہاں تمہارے
نخرے اٹھانے کا کسی میں بوتا نہیں ہے، جو دیتے ہو وہ نہ دیتا، اور کیا کر دوگے، تم کو
بیٹی بیاہی ہے کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا، ہاں اماں میری غلطی تھی میں ایسا ہی سمجھ
رہا تھا، اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی، جب میرے پاس
روپیہ تھا سب کچھ تھا اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی

بوڑھی ساس بھی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی

(۲)

بچوں کے لیے باپ ایک فالتو سی چیز، ایک تکلف ہے، جیسے گائے کے لیے کھلی یا بنولا
کے لیے مٹھائی، ماں روٹی دال ہے، مٹھائی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے، مگر روٹی دال ایک
دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھیے کیا حال ہوتا ہے، باپ کا درشن کبھی کبھی صبح شام مل جاتا ہے
وہ بچے کو اچھالتا ہے، پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر یا انگلی پکڑ کر سیر کرانے لیجاتا ہے
بس یہی اس کے فرائض کی حد ہے، وہ پردیس چلا جائے، بچے کو پروا نہیں ہوتی، مگر ماں
تو بچے کے لیے سب کچھ ہے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا
باپ کہیں بھی ہو اسے پروا نہیں، اسے تو صرف ایک اچھالنے کودانے والا آدمی چاہیے، مگر ماں
تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہیے، ہو بہو ویسی ہی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی مہک
وہ اگر نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے پھر تو وہ سسو کی

بھینسیں دوہتا رہتا ہوں، ان سب کاموں کے لئے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو بھی نہیں پوچھتا، الٹی اور گالیاں ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی، ذرا اسے کنوئیں سے کھینچ تو لو، گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔

ہری دھن ڈول لے کر کنوئیں پر گیا، اور پانی بھر لایا۔

اُسے زور کی بھوک لگ رہی تھی، سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی، مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی، تو وہیں کی ہو رہی، ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا پڑا سو گیا۔

دفعتہً اس کی بیوی نے آکر اسے جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا، کیا ہے کیا، پڑا بھی رہنے دے گی، کیا اور پانی چاہیئے

گمانی سخت لہجہ میں بولی، غراتے کیوں ہو، کھانے کو بلانے آئی ہوں۔

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آرہے ہیں، اس کے بدن میں آگ لگ گئی، میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا بھی نہیں سکتا، یہ لوگ مالک ہیں، میں ان کی جھوٹی پتل چاٹنے والا ہوں۔ میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی گھر ہے جہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی، سالے غلام بنے رہتے تھے۔ ساس منہ چومتی رہتی تھی، بیوی پوجا کرتی تھی۔ تب اس کے پاس روپیہ تھا جائداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے، اس کی ساری جائداد کو ان ہی لوگوں نے برباد کر دیا، اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑ رہے ہیں اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کو خوب لعنت ملامت کرے، مگر ضبط کر کے رہ گیا، پڑے پڑے بولا۔ مجھے بھوک نہیں ہے، آج نہ کھاؤں گا۔

گمانی نے کہا، نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو، کھاؤ گے تمہارے ہی پیٹ

خانہ داماد!

(۱)

جیٹھ کا دوپہر تھا، ہری دھن اکھ کے کھیت میں پانی دے کر آتا اور باہر ہی
بیٹھا رہا، گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا، اور ساتھ ہی چھن چھن کی آواز بھی
آرہی تھی اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے، اُن دونوں کے لڑکے بھی
آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے، مگر ہری دھن اندر نہ جا سکا ادھر ایک مہینے سے
اس کے ساتھ یہاں جو برتاؤ ہو رہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی وہ اس
کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی، کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے بھر گیا
میں کوئی کہاں تک گھر کا ٹھیکہ لئے بیٹھی رہوں کیا! اس سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بدلے
سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو
سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک بار بھی تو نہ نکلا کہ اماں! تم کیوں اس کی بے عزتی
کر رہی ہو! چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی، شاید میری گت پر وہ خوش ہو رہی تھی، اس
گھر میں وہ کیسے جائے، کیا پھر وہی گالیاں کھانے، وہی دل آزاریاں سہنے کے لئے!!
آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو جائے، کیا میں کسی سے کم کام
کرتا ہوں؟ دونوں سالے بیٹھے بیٹھے سوتے رہتے ہیں اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں
چھانٹی کاٹتا ہوں، اور یہاں سب لوگ پل پل پر چلاتے ہیں میں اتنا آنکھیں بند کئے اپنے
کام میں لگا رہتا ہوں شام کو گھر والے کھانا کھانے چلے جاتے ہیں میں رات تک کام پر

جو بے چینی ہے، میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال تھی، جلوس روانہ ہوا، اسی وقت پولیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا، مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی، پہلے تمہیں میری ضرورت تھی، اب مجھے تمہاری ضرورت ہے، پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں، اب میں تمہاری ہمدردی کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں، اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لئے تیار ہوں، اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بے جا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی، کیونکہ میں جانتی ہوں میں آزاد رہ کر جو کچھ کر سکتی ہوں جیل میں اس سے کہیں زیادہ کر سکتی ہوں۔ آزادی میں غلطیوں کا امکان ہے، بھٹکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے، رقابت کی فکر ہے، جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا، میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کو کھو دیتا ہے، لیکن انجن میں بند ہو کر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔

اور دیویوں کو بھی خبر ملی، سب کی سب مرولا سے ملنے آ پہنچیں، پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔

صفایا ہو گیا تھا کانگریس نامی انجمن قرار دے دی گئی تھی اس کے دفتر پر پولیس نے چھاپہ
مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا، پہلا آشرم پر بھی حملہ ہوا اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا ہم
نے ایک درخت کے سایہ میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے شام کو ہم نے ایک
جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا، کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور سوگ اور بیزاری میں جلوس
نکالنا ضروری تھا، لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے
ہم زندہ ہیں مستعد ہیں، میدان سے ہٹے نہیں، ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا
ثبوت دینا تھا، یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار
ہونے والے نہیں، ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خودغرضی اور جبر
پر رکھی گئی ہے، اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت
دینا بھی ضروری سمجھا، شاید پبلک کو دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار کا اخلاقی
احساس پیدا ہو گیا ہے، اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے، پبلک کے اس وہم کو دور کرنا
اس نے ناگزیر سمجھا، وہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرتے آئے ہیں اور
حکومت کریں گے، تمہاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پروا بھی نہیں، جلوس نکالنے کی ممانعت
کر دی گئی پبلک کو ہدایت اور تنبیہ کی گئی کہ خبردار جلوس میں نہ آنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے
گر شام کے وقت پانچ ہزار کا مجمع ہو گیا، آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا میں
اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی، ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی حوصلہ
نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا، آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس پایہ
پہنچ گئی تھی، جو بڑے سے بڑے سرکاری افسر کو بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل
نہیں، یہ دلوں کی حکومت تھی، یہ مجھ کو کیا نیا اختیار تھا، نہ انہیں مجھ سے کسی نفع کی امید
تھی نہ نقصان کا خوف تھا، ہرگز نہیں، پھر بھی وہ بڑے سے بڑے حکم کو سر و چشم ماننے
کو تیار تھے، اسی لئے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی تڑپ تھی کہ یہ جیسے سکو ...

یں اُٹھالیا، اس کے سینہ سے خون جاری تھا، میں نے اُسے جو دودھ پلایا تھا، اسے وہ خون
سے ادا کر رہا تھا، اس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے مجھے ایسا فتحمندانہ غرور ہو رہا تھا جو
شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا، لڑکپن، جوانی اور موت ساری
منزلیں ایک ہچکی میں تمام ہو گئیں، میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا، اتنے میں
اماں جی کا جنازہ بھی آ پہنچا، معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں، مجھے تو روکتی رہتی
تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں، گویا وہی سورگ کا راستہ ہو جب
ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں تینوں لاشیں رکھی گئیں، تب میرا سکتہ ٹوٹا، ہوش آیا،
اماں اپنے جنم بھر کی کمائی لئے جاتی ہے، جنہیں اتنے نازوں سے پالا، انہیں چھوڑ کیسے جاتی
وہ تو وہاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں، میرے لئے کیا چھوڑا، ایک بار جی میں آیا میں بھی
انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے لیکن
پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے جس کا معاوضہ یہ ملے، بہن! اس
چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لئے بیٹھی
مسکرا رہی ہیں۔ اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں، تم جاؤ اور بے فکر ہو کر کام کرو، اُن
کے چہروں پر کتنا جلال تھا، خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں، دور
سے یہ جلتی ہوئی چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں، جیسے دریا کے پل پر برقی لالٹینو
کی ایک قطار ہو۔ اسی پل ہو کر شہادت کی منزل ہے، اور یہی مشعلیں بقائے دوام کی طرف
لے جاتی ہیں۔ یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہو گئیں تو ہم لوگ لوٹے، لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی
میرے لئے اب وہ گھر نہ تھا، میرا گھر اب یہ ہے، جہاں میں بیٹھی ہوں یا پھر وہی چتا
میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ پہلا آشرم میں چلی گئی، کل کی گولیوں میں کانگرس کمیٹی کا

سے میرا مکان لب سڑک ہے، میں اسے پیچھے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی، ہراساں آدمی
بھاگے چلے آرہے تھے، سپاہی وہ نظارہ پاکر کے رد میں کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسی وحشت
ایسی سنگدلی کہ میں کیا کہوں، اگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جاں بازوں کی ایک
جماعت بھی جو دیوار کی طرح سامنے کھڑے گولیاں کھا رہے تھے، اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ
لیتے تھے، بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں اور ہر ایک دھائیں دھائیں کے
بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی، اس صدا میں کتنی کشش تھی، کیا جوش! اس
یہی جی چاہتا تھا کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور ہنستے ہنستے مر جاؤں، اُس
وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مرجانا کوئی کھیل ہے، اماں جی کمرہ میں بھان کو لیے مجھے
بار بار اندر بلا رہی تھیں جب میں نہ گئی تو بھان کو لیے ہوئے پیچھے چلی گئیں، اسی وقت
دس بارہ آدمی ایک سٹریچر پر سرے سوامی کی لاش لیے ہوئے دروازہ پر آئے، اماں
کی نگاہ پر نظر پڑی سمجھ گئیں مجھے تو سکتہ سا ہو گیا، اماں نے جاکر ایک بار لاش کو دیکھا
اُسے چھاتی سے لگایا اُس کا بوسہ لیا، اور سیدھی چوراہے کی طرف چلیں جہاں سے اب
بھی دھائیں دھائیں اور جے کی آوازیں آرہی تھیں، میں نقش دیوار سی لاش کو دیکھتی تھی کچھ
اماں جی کو نہ کچھ بولی نہ جگہ سے ہلی نہ روئی، نہ بے قرار ہوئی، احساس کی حد مٹا
موت سی ہو رہی تھی، اماں جی جاں بازوں کی صف میں جاکر سامنے کھڑی ہو گئیں اور
ایک منٹ میں اُن کی لاش بھی زمین پر گر پڑی، ان کے گرتے ہی جاں بازوں کا ضبط
بھی رخصت ہو گیا، ان کے سر پر خون سا سوار ہو گیا، نہتے تھے، مگر ہر ایک فرد اپنے دل
میں شیر کی قوت محسوس کر رہا تھا سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا تو بے بس ہو گئے
جانیں لے کر بھاگے، کوئی ادھر کوئی اُدھر، مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے تھے،
بھان پیچھے پر جھکا کھڑا تھا، نہ جانے کدھر سے آکر ایک گولی اس کے سینہ میں لگی، میرا لال
وہیں گر پڑا، سانس تک نہ لی مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے، میں نے بھان کو گود

اور کانسٹبلوں کو گھیر لیا، ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں، کانسٹبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں، دو کانسٹبلوں کے چوٹیں آئیں، اس کے بدلے میں دس بارہ آدمیوں کی جانیں لے لی گئیں چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں، تو یہ لوگ اس کا بے جا استعمال کرنے لگتے ہیں، گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے، گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا، غریب ہیں، بے کس ہیں، بے زبان ہیں، جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو، حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی امید چھوڑ دی، سوچتے ہیں، آخر اسی سرکار نے تو کانسٹبلوں کو تعینات کیا تھا وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کئے نہیں مانتا، گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا، پبلک اور کچھ نہیں کر سکتی، ہمدردی تو کرتی ہے، غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے، مظلوم کے لئے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے؛ اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر کچھ ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کی تشفی ہو جاتی، مگر پولیس نے ان گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا تھا، چاروں سمتوں پر کانسٹبل کھڑے کر دیئے گئے تھے، یہ زخم پر نمک تھا، مارتے بھی ہو اور رونے بھی نہیں دیتے، آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی مصیبت کی کہانی سنانے آئے ہنگامہ کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی، ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال ہو گیا، اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھلائے، بہت بڑا مجمع ہو گیا، میرے بابوجی بھی اس مجمع میں تھے، میں سمجھا رہی مت جاؤ، آج کا رنگ اچھا نہیں ہے کہنے لگے، میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں، پچاس ہزار آدمی حارث کے ساتھ تھے، اور پانچسو مسلح پولیس راستہ روکے ہوئے تھی، سوار اور پیادے پوری فوج تھی، جب بار بار پولیس کی دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہو گیا، فائر ہونے لگے، کتنے گھائل ہوئے، کون جانتا

بھلا کرتا جاتا ہے، پورے دو روپے میں من بھر گیہوں آتا ہے میری عمر ہی کیا ہے، اگلی بھی کہتی ہیں، اتنا سستا معاملہ کبھی نہیں تھا، کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں پاتے، سچائی اور محنت سب اوپر، غریب کہاں سے دیں سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے کسان اس پر بھی راضی ہیں، کہ ہمارے مال اسباب کو لے لو، زمین لے لو، مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھلانے کی فکر لگی ہوئی ہے، مسداروں نے کہہ دیا، ہم سے وصول نہیں ہوگا، اب پولیس لگی ہے، مسروری گنج کا علاقہ پیسا جا رہا ہے، مرا کیا کرتا ایک کسان کے گھر میں گھس کر کئی کانسٹبلوں نے اسے پیٹنا شروع کیا، بیچارہ چپ چاپ مار کھاتا رہا اس کی بیوی سے نہ رہا گیا، شامت کی ماری کانسٹبلوں کو گالیاں دینے لگی بس ایک کانسٹبل نے اسے برہنہ کر دیا اور بس کیا کہوں، ہمارے بھائی اتنی بے رحمی کریں اس سے زیادہ شرمناک اور کیا ہوگا، اب کسان سے ضبط نہ ہوا، کبھی پیٹ بھر روٹی کھانے کو ملتا نہیں اس پر اسی کڑی مشقت جسم میں نہ طاقت باقی رہتی ہے، نہ ہمت، مگر انسان کا دل ہی تو ٹھیرا، بیچارہ بے دم پڑا ہوا تھا، بیوی کا چلانا سن کر اٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا، ایک کسان کسی پولیس کے آدمی کے ساتھ اسی بے ادبی کرے اسے علاوہ کہیں برداشت کر سکتا ہے سب کانسٹبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا

چھما گاؤں کے اور لوگ تماشہ دیکھتے رہے ہوں گے

مرولا اس میں بھی اسرار ہے، اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے تو پولیس بھی مزاحمت کرنے سے پہلے آنے میں شائد ڈنڈے سے چلانا شروع کر دی اور اگر کوئی آدمی حصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیں، دو چار آدمی بھن جائے، اسی لئے لوگ جمع نہیں ہوتے لیکن جب وہ کسان مر گیا تو گاؤں والے طیش میں آئے، لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے

سے گلے مل کر رو کر، رُلا کر رخصت ہو گئی، گویا میکے سے بدا ہوئی ہو۔

(۲۳)

تین مہینے گذر گئے مگر مرولا ایک بار بھی نہ آئی، اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے، لتعلقوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آجاتی تھیں، لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا، ہر مہینے کے آخری اتوار کو وہ صبح سے مرولا کا انتظار کرنے لگتی، جب ملاقات کا وقت گذر جاتا تو ذرا دیر رو کر دل کو سمجھا لیتی، زمانہ کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کر کے اٹھی تھی کہ دیکھا مرولا سامنے چلی آرہی ہے نہ وہ چہرہ ہے، نہ وہ رونق، دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی، اور روتی ہوئی بولی، یہ تیری کیا حالت ہے، مرولا صورت ہی بدل گئی، تم بیمار ہو گیا ؟

مرولا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، بولی بیمار تو نہیں ہوں بہن مصیبت زدہ ہوں، تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہوگی، ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں۔ اور سارے فکروں سے آزاد ہو کر آئی ہوں۔

چھما کا دل کانپ اٹھا، سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اٹھی، ہولی معلوم ہوئی بولی، خیریت تو ہے ؟ اتنی جلدی تم پھر یہاں کیوں آگئیں۔ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔

مرولا زرد تبسم کے ساتھ بولی، اب سب خیریت ہے بہن، ہمیشہ کے لئے خیریت ہو گئی، کوئی فکر نہیں رہی، اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہوں، تمہاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی، تمہیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی، پرسوں شہر میں گولیاں چلیں، دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جا رہا ہے، کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں، غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بدن

تم آئی ہو مجھے یہ جیل خانہ سا معلوم ہوتا تھا، کبھی کبھی ملتی رہنا۔

مردلا نے دیکھا، چمپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، تشفی کے انداز سے بولی ضرور ملوں گی بہن، مجھے خود بغیر تم سے ملے چین نہ آئے گا، بھان کو بھی لاؤں گی، کہوں گی تیری ماسی آئی ہے، تجھے ملانے ہی ہے، دوڑا ہوا آئے گا، اب تم سے آج کہتی ہوں بہن یہاں تجھے کسی کی یاد آئی تو بھان کی، بیچارا اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا۔ اور روتا ہوگا، مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا، تم کہاں چلی گئی تھیں، جاؤ میں تم سے نہیں بولتا، تم میرے گھر سے چلی جاؤ، ترا شیطان سے بھی، دم بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیا، صبح اٹھتے ہی گاتا ہے، "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" "سوراج کا منتر دل میں ہے" (جھنڈا اونچا رہے ہمارا) (سوراج کا منتر دل میں ہے) جب ایک چھڑی کندھے پر رکھ کر کہتا ہے "تالی چمپا اب سپاہی تیار ہے" تو مجھے ہنسی آتی ہے باپ کو تو کہتا ہے "تم غلام ہو" ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں، بار بار سوچتے ہیں، استعفیٰ دے دوں، لیکن گذر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو، کیسے چھوڑیں، وہ اب تک چھوڑ بیٹھے ہوتے، بہن تم سے سچ کہتی ہوں نوکری سے انہیں نفرت ہے، لیکن میں ہی منع کرتی رہی ہوں، بیچارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے، کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے، ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں، وہ بیچاری بوڑھی اس کے ساتھ کہاں کہاں دوڑیں، چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے، وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا، اماں بہت بگڑیں گی، بس یہی ڈر لگ رہا ہے مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں، کل ماجی کہتے تھے، تم سے بہت ناراض ہیں، تین دن تو دانہ پانی چھوڑ دیا تھا، اس چھوکری نے کل کی مریاد ڈبا دی، خاندان پر داغ لگا دیا، کلموہی، کلچھنی، نہ جانے کیا کیا بکتی رہیں، میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی، پرانے زمانہ کی ہیں۔ ان سے کوئی چاہے کہ ہم لوگوں میں آ کر مل جائیں تو یہ ان کی زیادتی ہے، چل کر منانا پڑے گا، بڑی منتوں سے مانیں گی، کل ہی کتھا ہوگی، دیکھ لینا، برہمن کھائیں گے، جیل خانہ کا پرایشچت تو کرنا ہی پڑے گا، تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب

(۲)

○ مسز بھنڈاری جو اب تک مردولا کے پاس منتظر کھڑی تھی جس نے ایک معتبر کے
الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی اور دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر ایک مہینہ ہوا یہاں آئی
تھی ابھی میعاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے، یہاں کے سب قیدیوں میں سے کسی
سے اس کا دل نہ ملتا تھا، اور ادنیٰ باتوں کے لیے ان کا آپس میں جھگڑا رہتا، اس اندوق
کی چوروں کے لیے لنڈی والے ڈوروں کی خوشامد کرنا، گھر والوں سے ملنے کے لیے ان کو معزز
اسے پسند نہ تھا، وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں وہ خود داری جو
اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہیے، کسی میں بھی نہ تھی، ان کا مادہ
ذلت اسے مالکی معاملات کی چرچا میں صرف ہوتا تھا، چھما ان سے احتراز کرتی تھی
اس میں قوم کا درد اور ایثار جوش تھا اور جیل آنا، مگر دوسری دیویاں اسے مغرور سمجھتی تھیں
اور اعتراض کا جواب اعتراض سے دیتی تھیں، مردولا کو حراست میں گئے آٹھ دن ہوئے
تھے، اسے ان ہی دنوں میں چھما کو اس سے خاص انس ہو گیا تھا، مردولا میں تنگ دلی اور عیب
جوئی بدگوئی کی عادت، نہ آپس کا حسد، نہ بیہودہ مذاق، اس نے جیل پہ بتلایا تھا
جوش خدمت سے پُر ہمدردی سے لبریز، چھما نے سوچا تھا، اس کے ساتھ چھ مہینے خوب
سے گزر جائیں گے لیکن بدبختی یہاں بھی اسے پامال کرنے پر آمادہ تھی، کل مردولا یہاں سے
چلی جائے گی پھر وہ اکیلی ہو جائے گی، یہاں ایسا کون ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر بیٹھ کر
دل کی باتیں کرے گی، ملک اور قوم کی چرچا کرے گی، جس کی صحبت میں عادت پیدا ہمدردی
کی پرورش ہوتے

مردولا نے پوچھا، تمہیں ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں، بہن، بڑی مشکل سے گزریں گے
چھما نے حسرتناک لہجہ میں کہا، کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن، مگر تمہاری
یاد ہمیشہ ستایا کرے گی، اس ایک ہفتہ کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے

کے بیان کو فرضی ثابت کر دیا، اس وقت جانے مجھے کیونکر نکتے سوجھتے گئے، مجسٹرٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار ٹھکا بھی بتائی اور میرے سوالوں کا اُول جلول جواب دیتا تھا تو مجسٹرٹ بول اٹھتا تھا، وہ جو کچھ پوچھتی ہیں اس کا جواب دیجئے، فضول کی باتیں کیوں کرتے ہو، تب حضرت کا چہرہ ذرا سا نکل آتا تھا، میں نے سبھوں کو لاجواب کر دیا، ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ تو نہیں سنایا، لیکن مجھے یقین ہے بری ہو جاؤں گی، میں جیل سے نہیں ڈرتی لیکن بے وقوف بھی نہیں بننا چاہتی، وہاں سکریٹری صاحب بھی تھے، اور بہت سی بہنیں تھیں سب یہی کہتے تھے تم چھوٹ جاؤ گی۔

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کرکے چلی گئیں، ان میں سے کسی کی میعاد سال بھر کی تھی، کسی کی چھ مہینہ کی، کسی نے بھی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا، ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا، مرولا پولیس سے جرح کرکے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جا کر ایک دیوی نے کہا، اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے، ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید ہی نہیں۔

دوسری خاتون بولیں، یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے، گئی تو تھیں دھرنا دینے ورنہ دوکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، والنٹیر گرفتار ہوئے تھے آپ کی بلا سے، آپ وہاں کیوں گئیں، مگر اب کہتی ہیں، میں دھرنا دینے گئی ہی نہیں، یہ تو معافی مانگنا ہوا۔

تیسری دیوی نے فرمایا۔ جیل میں رہنے کے لئے بڑا کلیجہ چاہیئے، اس وقت تو واہ واہ کہلانے کے لئے آ گئیں، اب رونے لگیں۔ ایسی عورتوں کو تو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہیئے۔ تحریک کو بدنام کرنے سے کیا فائدہ۔

. . . .

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لے
کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے؟ اور
جیوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا تعجب کی بات ہے میری عقل
تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر۔ کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی، بھائی تمہاری ہی کیوں، دیو کی ماں تو کہتی
ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش۔ اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر۔ آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔

پرکاش۔ آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوایا کسی سے۔

ٹھاکر۔ کئی پنڈتوں سے۔

پرکاش۔ تو بس یہ اسی کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر ان کے گلے سے چمٹ گئی
اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت دنوں کے بعد گھر آ گیا ہو

پرکاش نے کہا آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔

"میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

"تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔"

"مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔"

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

کے گھر کی طرف چلا کسی ملول و شرمندہ کی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا اس کے پاؤں اب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے، لیکن تب کا ماتھے کا درد تھا آج کا سا نکلنے کا، اب نکار کا چڑھاؤ تھا، حرارت اضطراب اور علس سے نجات نکار کا اتار تھا، سکون فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا تب قدم پیچھے ہٹتا تھا آج آگے بڑھ رہا تھا

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دروازہ کا کنڈا کھولا، اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے زیور رکھ دیا، پھر دوڑا باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا، سوہن جی کتھیوں بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے حسن معانی مسرور کا لطف اٹھا رہے تھے، موسیقی کی جوتی پر کاش کو بھی سورہی تھی، جو پیسوں کو اپنے گھر لیے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی، گویا کسی گہری کھائی میں گرا جا رہا ہو آج ذرا کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ ایرو پلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے، اوپر، اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو دیر و سوما ہوا تھا، پیسوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے،

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر سویرے ہی جا پہنچا دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے

ویراسیدا سے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی، جو زیورات چوری گئے تھے سب مل گئے

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری، ایسا کا پیسا ڈوب گیا، ایک پیسہ بھی نہیں گئی جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔

پرکاش کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا، دکھنے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہوا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے، دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے، کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے، اس لئے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے، وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے۔ تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے، افسوس چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا، وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا، دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(۷)

کئی روز گذر گئے، پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی، اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے، ٹھاکر صاحب ان کی اہلیہ، ویماندر اور اس کی نئی دلہن سبھی آئے ہوئے ہیں، باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں، کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے، پرکاش نے کہا، آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا، دادا، میں اس وقت نہ جانے دوں گا

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی، چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں۔ اور نہ کافی جگہ ہی ہے، رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا، یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں، تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں، پرکاش جاگ رہا تھا، ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب

پرکاش نے سر جھکا کر کہا، دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں، میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔

"ابھی تم درخواست تو دو، اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائیگی اس کا فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا، آپ زرِ ضمانت داخل کر دیں گے؟

"ہاں ہاں، یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا، اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی، مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے، ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اُسے دلی صدمہ ہو رہا ہے، ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوش خبری سنائی، چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا، پھر ایک منٹ بعد بولی، ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی، جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہو جائے، تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟"

چمپا نے کہا، "آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آگیا، اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا، مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا، وہ اس کے اندرونی خیالات کا اندازہ نہ لگا سکا، مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اسے کھٹکنے لگا، اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے، چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا، اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا، پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا، چمپا کو وہ
تالی کسی طرح نہ ملی، ایک دن ایک گچھا الماری پر پڑا تھا، جا ساں تھے آنکلا، پہلے
اس تالے کی چابی مل گئی، اور صندوق کھول ڈالا، ارے یہ تو ریوالور ہیں، اس نے ایک
ایک ریوالور نکال کر دیکھا، یہ کہاں سے آئے، مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں
کی، معًا اس کے دل میں خیال گزرا، یہ ریوالور ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، جن کی چوری
بحث جن کا وہ ذکر کیا کرتے تھے، اسے اب کوئی شک نہ رہا، لیکن اسی بڑی شرم و ندامت
سے اس کا سر جھک گیا، اس نے یکدم صندوق بند کر دیا، اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی،
ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے! یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے! میں نے تو
کبھی ریوالوروں کے لیے انہیں تنگ نہیں کیا، اگر تنگ بھی کرتی، تو کیا اس کا مطلب
یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں، چند ریوالوروں کے لیے، ان کا ضمیر اتنا گرد
کیوں ہو گیا؟

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی، پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی، وہ
عرس کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی، اب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں
کہتے تھے، مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی
دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی

کئی مہینے گزر گئے، شہر کے ایک بنک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی، پرکاش
نے اکاؤنٹس کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت
داخل کی جائے، اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے، پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چل پڑی، ٹھاکر صاحب نے کہا تم
کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟

چمپا نے کہا، چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی، چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں، یہاں کیا رکھا ہے۔

پرکاش نے غصہ سے کہا کچھ نہیں ہے، برتن تو ہیں، غریب کے لئے اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی، تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی پائی تو بولا، صندوق تم نے ہٹایا تھا؟

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی میں کیوں ہٹانے لگی۔

"پھر کس نے ہٹایا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"گھر تم رہتی ہو، جانے کون؟"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں، چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی وہ صندوق کھول کر زیور دیکھنے لگا، آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں، پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں، اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی، پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا، اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لئے بولا طشتری میں کیا لائیں، آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی، پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔

اچھا پکوڑیاں ہیں۔

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ انکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا، صندوق میں کیا ہے، یہ

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا، اس گھر میں رہتے ہیں حد سے تھا، لیکن جب تک
شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر شام دن نہیں رہتے تھے، ہیں سدی کے لیے ساتھ
کہا ایک سیٹھ جی کے ہاں ۸۰ روپیہ ماہوار کا ایک کام مل گیا ہے مگر وہ روپیہ میں ان کی
کے پاس بھیج کرتا رہوں گا، وہ آمدنی صرف دیوروں میں خرچ ہوگی، اس میں سے ایک پیسہ
گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا، ماں مدد کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی نسبت پر ملال ہوا
دیورانیوں میں اس کا اعتقاد بھی پکا ہو گیا۔

اب تک کاس اور چمپا میں کوئی بلاد نہ تھا، پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا
کا تھا چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں، مگر
اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا اس کی چابی کہاں ہے اس کا چمپا کو پتہ
نہیں، وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کچھ نہیں پرانی کتابیں
ماری ماری پھرتی نہیں، اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔ چمپا کو شک کی گنجائش
نہ تھی

ایک دن چمپا انہیں پان دینے گئی، تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ
رہے ہیں، اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ جیسے فق ہو گیا، شبہے کا انکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پاکر
سوکھ گیا، چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبہے کو مدد ملتی

لیکن پانچ برس کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے، پرکاش کے
لیے ناممکن تھا وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی، اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا جون
کا مہینہ تھا گرمی کے مارے دم گھٹا جاتا تھا، چمپا نے کئی بار سونے کے لیے کہا مگر پرکاش
مانا، اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے

پرکاش ۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔
ٹھاکر۔ کیوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔
پرکاش ۔ آپ کہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جوابدہی آگئی، میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے، چور نے راستہ دیکھ لیا ہے، ممکن ہے دو چار دن میں پھر آگھسے، گھر میں اکیلی ایک عورت سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی، اُدھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے، ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا، تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی، میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی، ادھر کا رستہ بند ہی ہو جانا چاہیے، میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔
ٹھاکرائن ڈریں تم چلے جاؤ گے بھیا، تو گھر اور پھاڑے کھائے گا۔
پرکاش ۔ کچھ بھی ہو ماتا جی، مجھے بہت جلد گھر چھوڑنا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی، اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔
پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا، بڑا لائق آدمی ہے، چور ادھر سے آیا، یہی بات اسے کھا گئی، کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔
"مار ہی ڈالے!"
"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا!"
"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا، کتنا ہی سمجھاؤ!"
"کرایہ کے بیس دینے پڑیں گے۔"
"ہم کیوں کرایہ دیں، وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں، ہم تو کچھ کہتے نہیں۔"
"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا، ایسے آدمی کے لئے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا۔"
"میں تو سمجھتی ہوں وہ کرایہ لیں گے ہی نہیں۔"
"تیس روپے میں گذر بھی تو نہ ہو گی۔"

کرتا مجھے بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، وہ چلا گیا اب نہ ملے گا

پرکاش لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا

ٹھاکر - کوئی چارہ نہیں، ہاں اگر کوئی جاسوس پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو
اسے مال مل جائے، لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں، بعض لوگوں کو ڈھونڈ کر شیو پرشاد ہی کیا

پرکاش - آپ بیٹھے رہیے لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں میں ان نوکروں کے سامنے اور
کا نام نکلوا لوں گا

ٹھاکر - نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی ملال رہے گا
کہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے، جانے کدھر سے گیا ہو یہ چھت کیلیا ہے، تمہارے
کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے

ٹھاکر ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے، کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں
رہ گیا،

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا، بولا میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں ہاں کوئی
پہلے ہی سے موقع پاکر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے
تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی
دیئے جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا، وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان
پڑ گیا تھا پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان
وہاں بھی دکھائی دیئے، ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے، لحاظ کے مارے
کچھ نہ کہہ سکتے تھے، پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی، اب تو کوئی
شک ہی نہیں رہا

ٹھاکر صاحب نے کہا ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا
مال ہو جانا تھا وہ گیا، اب چلو آرام سے بیٹھو آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہو گی۔

"تم جا کر ان کو تسلی دو، ٹھکرائن بیچاری رو رہی تھیں، تمہارا نام لے لے کر کہتی تھیں کہ بیچارا مہینوں ان زیوروں کے لئے دوڑا، ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی، اور چور ٹھونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا؟"
پرکاش جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا، یہ تو بڑا غضب ہو گیا، ماتا جی مجھے تو ابھی چمپا نے بتلایا۔
ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے، بولے کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازہ کی چول نہیں اتری، سمجھ میں نہیں آتا، چور آیا کدھر سے۔
ٹھکرائن نے رو کر کہا۔ میں تو لٹ گئی بھیا! بیاہ سر پر ہے کیا ہوگا بھگوان، تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں، نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔
پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا، مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے
ٹھکرائن نے مخالفت کی، ارے نہیں بھیا، نوکروں میں ایسا کوئی نہیں، دس دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں، کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔
ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا، تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے جس نے اب تک چوری نہیں کی وہ چوری نہ کرے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا، میں پولیس میں رپورٹ کروں گا، اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا، کہیں مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔
پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا، کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں، تو ستم ہی ہو جائے گا، بولے پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔
ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا، تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو، بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زدوکوب بھی تو نہیں کر سکتے، ہاں پولیس میں رپورٹ

پھر بھی وہ کسی شاکر ہے ہاتھ چھپا پر ہم آ گیا، یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بیچارے کو ہر ایک چیز کے لیے ترستا پڑتا ہے، وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا، ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی، بیچ میں ایک ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ اونچی دیوار تھی، وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا

اس نے سوچا پہلے زینے سے اتر کر کوٹھری میں چلیں۔ اگر وہ جاگ گئے تو دور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا کیسا چکما دیا، یا کہہ دوں گا میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے، کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا، اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے، میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے، ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے، میں بے داغ نکل جاؤں گا شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا، پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ کر سکے

پھر بھی وہ خوف زینے سے اترنے لگا، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی، پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا، بڑا غضب ہو گیا، رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی، چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا، کسی نے پکڑا نہیں چور کو

"کسی کو خبر بھی نہیں، وہی ڈبہ لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے، نہ جانے کیسے چابی اڑا لی، اور کیسے انہیں معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی، باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں"

"دست بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اڑا لے گئے"

چمپا مسکرا کر بولی، چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گذر ہوتی جائے، یہی بہت ہے۔
پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا، چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا، زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے، اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں، مجھے اس کی امید نہ تھی۔
چمپا نے کہا، کوئی اور بات کرو، زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔
"ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔"
"زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے، میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہیں۔"
"ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے، اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لئے لیتے جاؤ۔"
"تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"
"اس میں بچپن کی کیا بات ہے، کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"
"میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا، جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"
"میں غیر نہیں ہوں، ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں، اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی، مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے، اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔"
رات کے بارہ بج گئے ہیں، پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی، بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔
یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں

ہوا۔ اسے پیسہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی مدت کی بات نہیں تھی، دیکھتے دیکھتے ایک حسب حال نوجوان ذمہ دار ممبر بن بیٹھا۔ کہیں رلدا اسے سلام کرنے آیا ہے، کہیں محلہ کا خیا گھیرے ہوتے ہے، کہیں کہیں اورشلیا، والا خوشامد کر رہا ہے، وہ چاہتا تو دو چار روپیہ آسانی سے اڑا سکتا تھا لیکن ایسا کیسے رہتا، پھر اُس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے، اس کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا

گھر آکر چمپا سے بولا، ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں، اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپیہ کے زیورات سوا ڈلتے ہیں، ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لئے پانچ ہزار کے زیور خریدے، ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھیرتی تھی

چمپا حاسدانہ لہجہ میں بولی، اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے، جنہیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں، یہاں تو رو رو کر مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں

چندر پرکاش — یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں، نہ کمانا نہ دھمکانا باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور عیش کرتے ہیں اسی لئے کہتا ہوں ایشور بڑا ہی منصف ہے

چمپا اپنا اپنا مقدر ہے، ایشور کا کیا قصور، تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو ہم بھی مزے اڑاتے، یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے، گہنے کپڑے کو کون روئے، کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جاؤں تو پہن لوں، میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھاکروں کے ہاں شادی میں کیسے جاؤں گی، سوچتی ہوں، بیمار پڑ جاؤں تو جان بچتی۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی، ساڑی تمہارے لئے میں لاؤں گا، یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے، زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی

توٹھاکر اُن نے کہا، ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے۔

پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے جو دیوانند کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔

پرکاش کو علیحدہ لے جاکر اُما دیوی نے کہا، تمہاری کیا صلاح ہے، دیرو کا بیاہ کر دوں، ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔

پرکاش نے مسکرا کر کہا، یہ تو دیرو بابو ہی سے پوچھئے۔

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا، میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔

ان کا بیسواں سال تو ہے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔

"تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں، میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے، پھر پچھتانا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"میرے رہتے ہوئے تو اس کی آپ فکر نہ کریں، ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی، یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے، جو انہیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے، پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی، اور شادی کا سامان ہونے لگا، ٹھاکر صاحب ان اشخاص میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا، ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربہ سے زیادہ قیمتی تھی، شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا، دس بارہ

زیور کا ڈبّہ

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔
اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی، اسی سال والد بھی چل بسے، اور پرکاش زندگی کے
جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ ان کی وساطت
سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی، مگر وہ سب منصوبے دھرے
ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف بیس روپیہ ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔
والد نے کوئی بھی جائداد نہ چھوڑی، الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر ڈال دیا، اور عورت بھی ملی تو
تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرار، جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرنا قبول
تھا۔ چندر پرکاش کو بیس کی نوکری کرتے شرم تو آئی تھی، لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے
کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل
ملا ہوا تھا، پختہ، ہوادار، صاف ستھرا، اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان
بیس روپے سے کم پر نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر
کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ
ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بہت عزت کرتے تھے، بلکہ اسے لڑکا ہی سمجھتے تھے۔ گویا
وہ ملازم نہیں، گھر کا آدمی تھا، اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے صلاح لی جاتی تھی۔

(۲)

شام کا وقت تھا۔ پرکاش نے اپنے شاگرد ویریندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی

وکیلوں سے مشورہ کیا، اسٹامپ لیا، بھاو رج کے نام آدھی جائیداد منتقل کرائی، اور چراغ جلتے جلتے حیران و پریشان، تھکن سے چور، امید و بیم سے معمور آکر تلیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا، تم آ گئے گردھر، کام کر آئے۔

گردھر نے کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ ہاں تلیا، کر آیا، اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمہارے ساتھ گردھر کی جان بھی جائے گی۔

تلیا اٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرہانے رکھ کر بولی، میں بہت اچھی ہوں گردھر، تم جب رات یہاں سے چلے گئے، تب ہی میری طبیعت سنبھلنے لگی، اور اب میں اچھی ہوں، سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ لیکن ابھی ابھی میں سو گئی تھی اور بنسی سنگھ مجھے سپنے میں کہہ رہے تھے، تلیا تو کیا ہوتا ہے، تیرا آدمی ہزار کوس پر بیٹھا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے، چاہتا تو دوسری کر لیتا لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے اور جنم بھر بیٹھا رہے گا، اگر تو نے اس سے دغا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا، تو اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا اسی دن میں تیری جان لے لوں گا۔ بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کے چہرہ کی طرف دیکھا جس پر اس وقت ایک روحانی جلال سا چمک رہا تھا۔ اور دفعتہً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سچی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا، اور بولا، سمجھ گیا تلیا تو دیوی ہے۔

تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لمحہ خوفناک ہوتی جاتی تھی، اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے، کہا ہے کہ آکر دیکھ جاؤ، کون جانے بچوں کہ نہ بچوں، تو اگر نہ بچے گی تلیا تو میں بھی نہ بچوں گا، دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا، پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی، ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا اور تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں قدم رکھا، تلیا اپنی کھاٹ پر ایک چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی۔ اور اس نیم تاریکی میں جاں بلب معلوم ہورہی تھی۔ گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی، اشک میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا، تولا یہ بدنصیب تمہارے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور لقیہ آواز سے بولی، تم ہو گردھر سنگھ تم آگئے اب میں آرام سے مروں گی، تمہیں ایک بار دیکھنے کیلئے جی بہت بے چین تھا، میرا کہا سنا معاف کر دینا اور میرے لئے رونا مت، اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر، یہ تو مٹی میں مل جائے گا لیکن میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پرچھائیں کی طرح سدا تمہارے ساتھ رہوں گی تم مجھے دیکھ نہ سکو گے، میری باتیں سن نہ سکو گے، لیکن تلیا آٹھوں پہر، سوتے جاگتے تمہارے ساتھ رہے گی، میرے لئے اپنے کو بدنام مت کرنا، گردھر کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔

گردھر زار وقطار رو رہا تھا۔ ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔

تلیا نے ذرا دم لے کر پھر کہا، میں بچوں گی نہیں گردھر، تم سے ایک منتی کرتی ہوں مانو گے۔

گردھر نے چھاتی ٹھونک کر کہا، اب جیوں گا تو اسی لئے کہ تیرا حکم پورا کروں۔

نہیں اس جندگی میں کیا رکھا ہے۔

ایک بے تاب خواہش تھی، اور بس، وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے، اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے، اس میں نہ تھی۔

اس نے چیں بجبیں ہو کر کہا، میں نہ جانتا تھا کہ تجھے میری زمین جائداد ہی سے محبت ہے تلیا مجھ سے نہیں۔

تلیا نے برجستہ جواب دیا، تو کیا میں جانتی تھی، کہ تمہیں میرے روپ اور جوانی ہی سے محبت ہے، مجھ سے نہیں۔

"تو محبت کو بازار کا سودا سمجھتی ہے"

"ہاں سمجھتی ہوں، تمہارے لئے محبت چار دن کا تماشا ہو گی، میں تو کہیں کی نہ ہو نگی میں اپنا سب کچھ نہیں دے رہی ہوں، تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا بھی چاہتی ہوں، تمہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو آدھی کیا ساری جائداد میرے نام لکھ دیتے لیکن تمہاری نیت معلوم ہو گئی، ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سمے آئے، لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے، اگر کوئی ایسا سمے آیا کہ تمہارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھا دے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے"

تلیا جھلائی ہوئی وہاں سے چلی گئی، مگر مایوس نہ تھی، نہ بے دل، آگے کیا ہونے والا ہے اس کے متعلق اسے مطلق شبہ نہ تھا۔

ٹھاکر نے جائداد تو اپنی دانست میں بچالی تھی، مگر بڑے مہنگے داموں، اس کا اطمینان قلب رخصت ہو چکا تھا، زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا، جائداد آنکھوں کے سامنے تھی۔ تلیا دل کے اندر۔ وہ سامنے آکر بیٹھنے والی تلیا، اب آرزو تھی جو حقیقت سے کہیں زیادہ دلآویز ہے، نشہ خیز ہے۔

تلیا اسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آجاتی، وہ خواب ہی کی طرح غائب ہو جاتی، گردھر اس سے اپنا درد دل کہنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا، لیکن تلیا اس کے سایہ سے

"تمہارا وں کیسے؟"

"میں نے تیرا کوئی حکم ٹالا ہے؟"

"تم سمجھتے ہو گے کہ تم کو ایک رنگین ساڑھی اور دو ایک چھوٹے موٹے گہنے دے کر
پھسالوں گا، میں ایسی الہڑ نہیں ہوں"

تلیا ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ گئی تھی، ٹھاکر حیرت میں آکر اس کے منہ کی
طرف تکنے لگا

تلیا نے پھر کہا، آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے، تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا کر لیتا ہے

ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا تو تو چل میرے گھر میں مالکن بن کر رہ۔

تلیا آنکھیں مٹکا کر بولی، آج مالکن بن کر رہوں، اور کل لونڈی بن کر بھی نہ
رہنے پاؤں کیوں؟

"تو جس طرح سر اس گھر میں رہ کر میں تیرا غلام ہوں"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں سچ کہتا ہوں"

"مکر تو نہ جاؤ گے"

"تھوک دے کر پھر جانا مردوں کا کام ہے؟"

"تو اپنی آدھی جائیداد میرے نام لکھ دو"

ٹھاکر اپنے گھر میں ایک کوٹھڑی، دس پانچ بیگھے کھیت، کچھ کپڑے اور
عورت تلیا کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا لیکن آدھی جائیداد اس کے نام کرنے
کی ہمت اس میں نہ تھی، کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائیداد سے
ہاتھ دھونا پڑے، ایسے موقع کا کیا اعتبار، اسے یہ گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے ایسا سنگین مطالبہ
کرے گی، اسے تلیا پر غصہ آتا تھا، اس نے شاید کہا ہو گی ہے کہ کیسی پکی میں الہڑ ہوں، اس کی ...

یہ کچھ ایسی بے نیازی، کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے حوصلے پست ہو جاتے تھے، سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ آسمان پر اڑنے والے طائر پرابن کے لالچ سے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا، مگر آج وہ طائر اس کے مکان کے سامنے والی شاخ پر آ بیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ بھوکا ہے، پھر کیوں نہ وہ دانہ اور جال لے کر دوڑے۔

اس نے مخمور ہو کر کہا، میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تلیا تو کیوں سر پر اٹھائے۔

"تلیا نے تسکار پر وار کیا، "اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے کہ ٹھاکر کو کیا ہو گیا ہے"۔

"مجھے کتوں کے بھونکنے کی پروا نہیں"۔

"لیکن مجھے تو ہے"۔

ٹھاکر نے نہ مانا، گٹھا سر پر رکھ لیا، اور اس طرح چلا گویا کونین کا خزانہ لئے جاتا ہو۔

(۴)

ایک مہینہ گذر گیا، تلیا نے ٹھاکر پر موہنی ڈال دی تھی، اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی، کبھی بنسی ڈھیلی کر دیتی، کبھی کھینچ لیتی، لگاوٹ بازی ہی تھی اور پر ہیز بھی اور ٹھاکر کی آتش شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی، اپنا ایمان اور دھرم سب کچھ نثار کر کے بھی وہ حصول مدعا کے قریب نہ آیا تھا، تلیا آج بھی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا، اس طرح کب تک جلائے گی تلیا، چل کہیں بھاگ چلیں
تلیا نے پھندے کو اور کسا، ہاں اور کیا، جب تم منہ پھیر لو تو کسی کام کی نہ رہوں دین سے بھی جاؤں۔ دنیا سے بھی۔

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا، اب بھی تجھے مجھ پر بشواش نہیں آتا۔

"بھونرے پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں"۔

"اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں"۔

طاقتور تھا، اپنے فولادی قویٰ سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کر سکتا تھا۔ اور اس بات کے سناٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا، مگر اس کی اُس عفت آمیز تنبیہ نے بنسی سنگھ کو کس طرح رام کر لیا، گویا کوئی خونخوار اژدہا سر پلار اگ سن کر سست ہو گیا ہو اور اپنا حیوانی ارادہ ترک کر کے اس راگ کی تالوں پر ناچنے لگے، اسی سچے سورما کی آبرو آج خطرہ میں ہے، کیا تلیا اس آبرو کو لٹنے دے گی، اور خاموش بیٹھی رہے گی، نہیں نہیں، نہیں۔

بنسی سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط، وہ مردانہ تحمل، وہ ذوقِ شہادت، وہ سچا عشق وہ اپنی شمع حیات بجھا کر سوزِ نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا شجاعانہ عمل، وہ اس کے فیصلہ پر جان نثار کر دینے کا جذبہ نیاز، نہیں نہیں بنسی سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا، تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آرزو سے زیادہ عزیز ثابت کر دے گی، اپنی سحر طرازیوں سے، اپنی محبت نوازیوں سے، اپنی شیریں اداؤں سے، اپنی عصمت کو گوشہ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے، وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا، ابھی تم مت جاؤ، بہن کہیں مت جاؤ، پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو، میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا، تمہاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور مسکرائی، اس نے کہا۔ تو یہ فن کیا جانے تلیا!

"کونسا فن"؟

"یہی مردوں کو الّو بنانے کا"

"یہ فن سبھی عورتوں کو آتا ہے، بہن کہیں سیکھنے جانے کا کام نہیں"۔

"اچھا بتا تو کیا کرے گی؟"

اپنا حق مانگتی ہوں، میں رکھیلی نہیں ہوں، اڑھری نہیں ہوں، بیاہتا ہوں۔ دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ میں بیاہ کے آئی ہوں۔ اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی آج کوئی نہ دے، میں اناتھ ہوں، لیکن چاہے میری آبرو جائے، ان کو منا کے چھوڑ دوں گی اور اپنا حصہ لے کر رہوں گی۔

"تیرے بھیا" یہ دو لفظ تلیا کو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے سے لگا لیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، تو بہن میرے گھر میں چل کر رہو اور کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تلیا مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے گی، میرا گھر تمہارے رہنے کے لائق نہیں ہے میں بھی غریب ہوں، لیکن گھر میں چاہے اور کچھ نہ ہو، شانتی تو ہے، اور میں کتنی ہی غریب ہوں لیکن تمہاری بہن تو ہوں۔

ٹھکرائن نے اس کے چہرے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا، ایسا نہ ہو میرے پیچھے میرا دیور تمہارا دشمن ہو جائے۔

تلیا نے دلیرانہ انداز سے کہا۔ میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی، اور پھر ان سے کہنے ہی کون جاتا ہے، اور تم پردہ میں رہتی ہی ہو۔

ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آکر بیٹھ گئی، وہاں ایک ہی کھاٹ تھی، تلیا نے اس پر بچھے کو لٹا دیا، چمارن کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے، کیسے پانی پیئے، تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن کھا نڈے لائی اور ٹھکرائن کے لئے ایک کوٹھڑی الگ کر دی، ٹھکرائن مغرور تھی، آرام پسند تھی، مگر دھن کی پوری۔ تلیا اس کے برتن دھوتی اس کے کپڑے صاف کرتی، اس کا بچہ کھلاتی، ٹھکرائن اس طرح کام لیتی تھی۔ گویا وہ اس کی لونڈی ہے، لیکن تلیا کتنہ نازک مخلوق کے ساتھ وفا کا نباہ کر رہی تھی اس کا من کبھی نہ میلا ہوتا۔ ماتھے پر کبھی نہ بل پڑتا۔

ایک دن ٹھکرائن نے کہا۔ تولا تم بچے کو دیکھتی رہنا، میں دو چار دن کے لئے ذرا باہر

کر رہا ہے بس ایک بانہہ پکڑے کی لاج کو نبھا رہا ہے، تو میں عورت ہو کے اس کے ساتھ
دغا کروں۔

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چٹھیوں کی پٹاری لا کر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی، مگر ٹھاکر
کو چٹھیوں کے پڑھنے کا ہوش کہاں تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔
ہونٹ پھڑکے جا رہے تھے، چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا، مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا، بولا! میں
نے تم کو پہچانا نہ تھا اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو، اسی وقت مار
ڈالو۔ ایسے روسیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا، میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔
بس اب یہی آرزو ہے کہ تمہارے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا، وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کئے جاتا ہے
جھلا کر بولی، مرنے کو جی چاہتا ہے، تو مر جاؤ، کیا دنیا میں کنوئیں تالاب نہیں ہیں یا تمہارے
پاس تلوار کٹار نہیں ہے، میں کسی کو کیوں ماروں۔

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا۔ تو تمہارا یہی حکم ہے؟

میرا حکم کیوں ہونے لگا، مرنے والے کسی سے حکم نہیں لیتے۔

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی کسی کی سمجھ میں
نہیں آیا کیسے ڈوب گیا۔ یہی خیال ہوا کہ نہانے آیا ہوگا، پاؤں پھسل گیا ہوگا، کئی دن تک کیا
کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا، تلیا نے زبان تک نہ کھولی، ٹھاکر کے مرتے
ہی بھائی نے جائداد پر قبضہ کر لیا، اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگا، دیورانی طعنے
دیتی، دیور عیوب لگاتا، آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آ کر بچے کو لے کر گھر
سے نکل پڑی، رات کا وقت تھا۔ تلیا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی، لالٹین جل رہی تھی
ہمدانی کے دام تھے، سہ ماہی ہزار روپے ہیں، اس کی بڑی فراغت سے گذران ہوتی

پکڑنے کی ماس ہیں، انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی ماس ہوئے تھیں گی انگلی۔ ملانے کیسے
وہ اس کے دھوکے میں آ گئی، انہیں دھوکے میں نہیں آئی، اُسے اس کی حوالی پہ رہیں
آتا، ایک دن وہ پکے ہوئے تلمی آم لوٹا، ملانے اپنی زندگی میں تلمی آم رکھائے
تھے، آم اس نے لئے، پھر تو روز آم کے ٹوکرے آنے لگے، اور آم نے کسی جگہ
حد آتا اور عجیب کرامات کرتا، کہیں کوئی دیکھ نہ لے، گالوں میں سو ریح جائے گا ایک
دن جب ملیا آم کی ٹوکری کا لے کر گھر میں جائے گی تو جسی گھرے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے
سینہ پر رکھ لیا، اور جھٹ اُس کے پیروں پر گر پڑا اور بولا ملیا اگر اب بھی مجھے محمد پر دیا
نہیں آتی تو آج مجھے مار ڈال، اپنے ہاتھوں سے مار ڈال، بس اب یہی اچھا لگتا ہے
ملیا نے آم کی ٹوکری پھینک دی، اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی،
اور اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی، اٹھا ٹھ کر اب یہاں سے چلے جاؤ۔
نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں نہ رہوں گی، تمہارے آموں میں آگ لگے، اور تم کو کیا
کہوں، میرا آدمی کالا کوبڑا ہے، پر میرے نام رمٹھا ہوا ہے اسی لئے کہ میں یہاں سے کے تمام
کو کلنک لگاؤں؟ وہ مرد ہے، چاہے جیسا ہے، کیا وہ دوسری نہ کہہ سکتا تھا جو تو نے
سمجھا ہی کی ہے لیکن وہ میرے نام پر مٹھا ہوا ہے، ہکر مٹھا ہوا ہے تم کم پٹھا
نہیں ہے تمہارے جیسا سد چاہے نہ ہو، پڑھو گے اس کی جٹھیاں تو وہ میرے نام
جپتا ہے، آپ چاہے جس حال میں ہو، میں کوں یہاں تمہیں دیکھتی ہوں لیکن ہر تمہارے
جیسے سر سے لے ویسا ہی ویسا ہے اسی لئے کہ میں دوسروں سے پیار کروں، وہ ایک پیسہ
بھی نہ سمجھے، لیکن جب تک وہ ایسی پر تم بھری جٹھیاں بھجتا رہے گا جب تک وہ مجھ کو اپنی
اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا ملیا اسی کی رہے گی، دل میں بھی، دکھاوے میں بھی، جب
اس سے میرا بیاہ ہوا ہے تب میں پانچ برس کی الھڑ چھوکری تھی تمہارے جیسا بھی
پر حالی تھی لو ہم دیکھ دیتے تھے ماں نے میرے ساتھ کیسا کہو اٹھا، جو سر لے آتا

تازہ تھے، اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ، جہاں ہوا کا گذر نہ تھا، ان میں وہی لطافت تھی، وہی لذت، وہی شیرینی، آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا! کھلا پڑتا تھا، گھونگھٹ نکال کر، بھاؤ بنا کر، منہ پھیر کر، اور ایک دل آویز تبسم کے ساتھ دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی وہ اس واقعہ کو بیان کرتی، جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھا۔ شبنم میں کھلے ہوئے پھول کی طرح دل آویز، وہ پھول اب بھی تازہ تھا، اس میں وہی خوشنمائی تھی، وہی خوشبو، واقعات زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک، تمنا ابھی تک تمنا کی سرخوشیوں اور کیفیتوں سے مرتبع تھی، جسے کشاکش حیات نے بے جان نہ کر پایا تھا۔

(۲)

تلیا کسی زمانہ میں حسین تھی، کافر ادا تھی، قاتل تھی، اور اپنے کشتگان ناز کی درد بھری داستانیں جب وہ بچشم پُرنم کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالم زیریں یا عالم بالا میں وجد کرتی ہوں گی، زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی انہیں پر ہمدردی اور وفا کے پھول نثار کرتی تھی، اس کی اُٹھتی ہوئی جوانی تھی، کہ ماں باپ رخصت ہو گئے تھے، بھائی بھی پردیس چلا گیا، وہ گھر میں اکیلی رہ گئی، وہ جدھر سے نکل جاتی تھی نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے، تب بنسی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا بڑا چھیلا، بڑا رسیا، دن میں سیکڑوں بار اس کے گھر کے چکر لگاتا، تالاب کے کنارے کھیت میں کھلیان میں، کنوئیں پر جہاں وہ جاتی، سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا کبھی دو دھیلے کر اس کے گھر جاتا، کبھی گھی لے کر، کبھی ساڑیاں لیکر، کہتا، تلیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ تو میری بھینٹ لے لے، تو مجھ سے بولنا نہیں چاہتی۔ مت بول میری صورت دیکھنا نہیں چاہتی مت دیکھ، لیکن جو کچھ میں لاؤں اُسے لے لے، بس اسی سے میرا دل بھر جائے گا۔ بھولی بھالی تلیا ایسی اہلی نہ تھی، جانتی تھی یہ انگلی

ن حلوطکو پاکر تکا مکسے اندلدہ مسرت ہوتی، اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے، ما
ار پر پھواتی اور ما ماری روتی، اور اس دن میرے سر میں تیل ڈالی، سندور سے
مانگ بھرواتی، رنگین ساڑی پہنی، اس کا سہاگ جاگ اٹھا تھا، میں مارے
پوچھیں کیوں تو وہ بوا میرے سوہاگ کو دیکھا تو ہوگا، اُس کی کچھ یاد تی ہے او تکا
کے پُرشکن چہرے پر حوالی عود کر آتی، آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا، کبھی، یاد
کیوں نہیں آتی، بیٹا اُن کی صورت اب بھی میرے سامنے ہے، بڑی بڑی آنکھیں، لال
لال ڈورے کا تھا، چوڑی چھاتی، السا لوات یہاں کوئی مشکل ہی نہیں ہے، موتیوں کے
سے دانت تھے بیٹا، لال لال کرتا پہنے ہوئے تھے جب بیاہ ہو گیا تو میں نے اُن سے کہا
میرے لئے بہت سے گہنے بنوا دو گے یا؟ نہیں تو میں تمہارے گھر نہ آؤں گی لڑکپن تھا
مشا، شرم لحاظ کچھ تھوڑے ہی تھا، وہ میری بات سن کر بڑے زور سے ہنسے اور مجھے اپنے
کندھے پر بٹھا کر بولے، میں تجھے گہنوں سے لاد دوں گا، بیاہ کیسے گہنے پہنے گی تو، میں
پردیس کمانے جاتا ہوں، وہاں سے روپے بھیجوں گا تو بہت سے گہنے بنوا دوں گا اور جب
میں آؤں گا، تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا، مرا ڈولا گیا تھا، بیٹا ماں باپ
کی ایسی حیثیت کہاں تھی کہ انہیں رلت کے ساتھ ملاتے، انہیں کے گھر میرا ان سے
بیاہ ہوا اور ایک دن میں وہاں رہی، اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسے بھاگے
کہ جب وہ چلے گئے، تو ان کے گلے لپٹ کر روئی تھی، اور کہتی تھی، مجھے بھی اپنے ساتھ
لے چلو، میں تمہارا کھانا پکاؤں گی، تمہاری کھاٹ بچھاؤں گی، وہاں انہیں کی عمر کے
دو تین آدمی اور بیٹھے تھے، انہیں کے سامنے وہ ہنس کر میرے کان میں بولے، اور
تم میرے ساتھ سوئے گی بس اس میں ان کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی، اور گر کر
بولی گالی دو گے تو کہے دیتی ہوں، ہاں

لاکھوں ہی ماراس کے سامنے سے نکل چکے تھے، مگر اس کے لیے وہ ہمیشہ

کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا، سب ہی اسے اپنے گھر میں ایک گوشہ دینے کو تیار تھے، مگر وضعدار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے، کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت میں بٹہ لگائے، جس کی اس نے کبھی صورت بھی نہ دیکھی تھی، صرف نام سنا تھا، ہاں صرف نام سنا تھا، جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی، اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رو گٹھیلا نوجوان تھا، شادی کے بعد وہ پورب کی طرف کمانے چلا گیا، سوچا تھا، ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے اتنے دنوں کچھ نہ کچھ روپے جمع کر لیں اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں، لیکن بیوی بالغ بھی ہو گئی، جوان بھی ہو گئی، بوڑھی بھی ہوئی وہ لوٹ کر نہ آیا، اس کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے، اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا، خط کے لفافہ کے اندر جواب کے لئے ایک خالی لفافہ بھی رکھا ہوتا تھا، یہی وہ رشتہ تھا جو ان میاں بیوی کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھا۔ خط میں وہ اپنی مجبوری اور بدنصیبی کا اظہار کرتا، اور لکھتا "کیا کروں تولا، دل میں یہی ارماں ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا، اپنی جھونپڑی آباد کر دیتا، مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ ہے، اپنا کوئی بس نہیں ہے، جب بھگوان لائیں گے تب آؤں گا تم صبر کرنا، میرے جیتے جی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی، تمہاری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا، جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تب کیا ہوگا، کون جانے"۔ قریب قریب یہی مضمون الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا اور یہ خط "تُلیا" کے حرزِ جاں تھے، ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا، ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں، ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہو گیا تھا، بوسیدہ بے رنگ سیاہی تک اڑ گئی تھی، کاغذ کا رنگ بھی اڑ گیا تھا، مگر سب کے سب جوں کے توں، اس کی پٹاری میں ایک لال ڈورے سے تہ بتہ بندھے ہوئے رکھے تھے

...ست

منشی پریم چند صاحب

ناشران
حالی پبلشنگ ہاؤس